افسانچے کا فن
(افسانچے کے فن پر اپنی نوعیت کی پہلی کتاب)
انتخاب، ترتیب اور مقدمہ
محمد علیم اسماعیل

افسانچے کا فن
(افسانچے کے فن پر اپنی نوعیت کی پہلی کتاب)
انتخاب، ترتیب اور مقدمہ
محمد علیم اسماعیل
UQAABI 03058519838

AFSANCHE KA FUNN
Compiled by:
Mohd Alim Ismail
Year of Publication: 2021
ISBN 978-93-91238-17-9
Price:Rs.200/ -

نام کتاب	:	افسانچے کا فن (انتخاب، ترتیب اور مقدمہ)
مرتب ناشر	:	محمد علیم اسماعیل
تعداد	:	500
سنہ اشاعت	:	2021
ضخامت	:	168 صفحات
قیمت	:	200 روپے
سرورق	:	وسیم خان کاتب، ناندورہ
مطبع	:	روشن پرنٹرس، دہلی۔٦

Published by
EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
H.o. D1/16, Ansari Road, Darya Ganj, New Delhi-110002 (INDIA)
B.o. 3191, Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph:45678285,45678286,23216162,23214465,Fax:0091-11-23211540
E-mail:info@ephbooks.com,ephindia@gmail.com
website: www.ephbooks.com

انتساب

:

:

:

:

ڈاکٹر ایم اے حق.... کے نام.................
جنھوں نے اس کتاب کی تیاری میں میری مدد کی
جو ہر کسی کی مدد کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے.....
اس کتاب کی مجوزہ اشاعت پر وہ کافی خوش تھے
یہ کتاب ان کی زندگی میں ہی شائع ہونی تھی.....
لیکن کورونا وائرس کی وبا اور......................
لاک ڈاؤن کی پابندیوں نے ایسا ہونے نہ دیا
اور اس وبا سے لڑتے لڑتے......................
وہ اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔
اللہ رب العزت انھیں غریقِ رحمت کرے۔

مشمولات

مضامین

افسانچے کا فن اور اقتباسات

افسانچے کا فن اور تاثرات

انٹرویو

چند منتخب افسانچے

''اگر یہ کتاب آپ کو کسی نے مفت بھیجی ہے تو مجھ پر احسان کیا ہے، اگر آپ نے کہیں سے چرائی ہے تو میں آپ کے ذوق کی داد دیتا ہوں، اپنے پیسوں سے خریدی ہے تو مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ اب بہتر یہی ہے کہ آپ اس کتاب کو اچھا سمجھ کر اپنی حماقت کو حق بجانب ثابت کریں.....'' (پطرس کے مضامین)

بس یوں سمجھ لیجیے کہ یہ جملے میں اس کتاب کے متعلق محسوس کرتا ہوں۔

محمد علیم اسماعیل

مقدمہ

افسانچے کی بڑھتی مقبولیت اور اس کے نام پر سامنے آ رہی ہر قسم کی تحریروں کو دیکھتے ہوئے یہ بات کافی عرصے سے ذہن میں تھی کہ ایک ایسی کتاب معرض وجود میں آئے، جس سے افسانچے کے فن کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

افسانچہ کیا ہوتا ہے؟
افسانچہ کس طرح لکھا جاتا ہے؟
اس کے کیا کیا لوازم ہیں؟

الغرض ایک ایسی کتاب، ہو جو فنِ افسانچہ کے متعلق تقریباً تمام سوالات کے جوابات کا احاطہ کرتی ہو۔

پہلے اس موضوع پر میں نے خود ہی ایک کتاب لکھنے کا ارادہ کیا اور لکھنا بھی شروع کیا۔ لیکن میں اسے ایک طویل مضمون کی حیثیت سے زیادہ نہ لکھ سکا۔ کیوں کہ میرے ذہن میں جتنی باتیں تھیں، مختصراً میں انھیں لکھ چکا تھا۔ پھر خیال آیا کہ میں اپنے اس مضمون کو اتنا وسیع کروں کہ کتابی شکل بن جائے لیکن مجھے یہ بات مناسب نہیں لگی کیوں کہ میں کسی بات کو سیدھے سیدھے سمجھنے اور سمجھانے میں یقین رکھتا ہوں۔ الفاظ کے ذخیرے میں سے اصل بات تلاش کرنا مجھے پسند نہیں۔ تو پھر میں اس طرح کے امتحان میں قارئین کو کیسے ڈال سکتا ہوں۔ پھر میں نے سوچا کہ یہ تو ہوئے میرے نظریات، اب اس میں سینئر افسانچہ نگاروں کے نظریات بھی شامل کر لینے چاہئیں اور اس طرح میں نے کتاب کو ترتیب دینے کا فیصلہ کیا

جو آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

معروف افسانچہ نگار جوگندر پال نے مختصراً ہی سہی لیکن جامع اظہارِ خیال کیا ہے۔ یہ مضمون مشہور ویب سائٹ ''ریختہ'' پر موجود جوگندر پال صاحب کی کتاب میں شامل ہے۔

ڈاکٹر ایم اے حق ایک ایسے ادیب ہیں جو صرف افسانچوں کے حوالے سے جانے جاتے ہیں۔ وہ جتنے اچھے افسانچہ نگار ہیں اتنے ہی اچھے افسانچوں کے نقاد بھی ہیں۔ وہ افسانچوں کو بڑی باریک بینی سے دیکھتے ہیں اور معمولی سے معمولی غلطی بھی پکڑ لیتے ہیں۔ اس کتاب میں شامل اپنے مضمون 'افسانچہ کیا ہے؟' میں موصوف نے مثالوں اور حوالوں کے ذریعے فنِ افسانہ کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر ایم اے حق نے اپنے مضمون 'افسانچہ کیا ہے؟' میں تقریباً تمام باتوں کا احاطہ کر لیا ہے کہ افسانچہ کیا ہوتا ہے؟ کیسا ہوتا ہے؟ اس میں کیا ہونا چاہیے اور کیا نہیں؟ ڈاکٹر ایم اے حق کہتے ہیں کہ وہ کئی برسوں سے اس طرح کا مضمون لکھنے کی سوچ رہے تھے لیکن اپنی مصروفیات کی وجہ سے لکھ نہیں پائے۔ وہ دیگر ادبی اور غیر ادبی کاموں میں اس طرح الجھے رہے کہ افسانچے کے فن پر مضمون لکھنے کے لیے انھیں موقع ہی نہیں ملا۔ ایک روز میں نے انھیں فون کیا اور عرض کی کہ میں افسانچے کے فن پر ایک کتاب ترتیب دے رہا ہوں اس کے لیے آپ کو ایک مضمون لکھنا ہے۔ انھوں نے مجھ سے وعدہ تو کر لیا تھا لیکن عدیم الفرصتی کے وعدہ پورا نہ کر سکے۔ میں بار بار فون کرتا رہا، اصرار کرتا رہا۔ آخر کار انھوں نے لکھنا شروع کیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ان کے قلم سے افسانچے کے فن کا تقریباً مکمل احاطہ کرتا ہوا مضمون مکمل ہو ہی گیا، جسے میں ان کی زندگی کے تجربات کا نچوڑ سمجھتا ہوں۔

محمد بشیر مالیر کوٹلوی مشہور افسانہ و افسانچہ نگار ہیں۔ 'ماہنامہ شمع' میں ان کے افسانچے تواتر سے شائع ہوتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''افسانچہ، سمندر کو کوزے میں بند کرنے کا فن ہے لیکن جب کوزہ کھلے تو سمندر بھی نظر آئے۔'' وہ افسانچے کو ایک نازک صنف تسلیم کرتے

ہیں۔ انھوں نے اپنے مضمون 'کامیاب افسانچے کی خوبیاں' میں افسانچے کی حقیقی صورت حال کو سامنے رکھتے ہوئے مفید گفتگو کی ہے اور بتایا ہے کہ کامیاب افسانچہ کیسا ہوتا ہے۔ انھوں نے مختلف مثالیں دے کر اپنی بات کو سمجھانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ ان کا ایک اپنا انداز ہے جو اُن کی تحریر کو منفرد بناتا ہے۔ ویسے بھی وہ اس فن کے مشاق قلم کار ہیں۔ افسانہ اور افسانچہ کے فن پر ان کی ایک مکمل کتاب منظرِ عام پر آچکی ہے۔

ڈاکٹر عظیم راہی کا شمار افسانچے کی باقاعدہ تنقیدی بنیاد ڈالنے والوں میں ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ ایک افسانچہ نگار بھی ہیں۔ لیکن لوگوں نے انھیں 'اردو میں افسانچہ کی روایت: ایک تنقیدی مطالعہ'' سے اوپر اٹھ کر نہیں دیکھا۔ ناقدین نے جب بھی ان کا ذکر کیا ہے اسی کتاب کے حوالے سے کیا ہے۔

ڈاکٹر عظیم راہی نے اپنے مضمون 'اردو افسانچے کے مسائل' جیسا کہ عنوان سے ہی ظاہر ہے، میں افسانچے کے مسائل کا احاطہ کیا ہے۔ ان کا یہ مضمون افسانچے کی سمت و رفتار کا پتا لگانے میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ انھوں نے افسانچے کے مسائل اور خاص کر اکیسویں صدی میں افسانچے کے مسائل کی نشاندہی کر کے کچھ حد تک ان مسائل کا حل بھی بتا دیا ہے۔

پروفیسر اسلم جمشید پوری نے افسانے اور فکشن کی تنقید کے ساتھ ساتھ افسانچے بھی قلم بند کیے۔ انھوں نے اپنے مضمون میں افسانچہ نگاری کے ارتقا کو بیان کرتے ہوئے اس کے فن پر بھی گفتگو کی ہے۔ ان کا مضمون، افسانچے کی مختصر تاریخ بھی ہے اور تنقیدی بھی۔ افسانچے کے فن پر کتاب ترتیب دینے کا خیال جب میرے ذہن میں آیا تب میں نے یہ بات سب سے پہلے پروفیسر اسلم جمشید پوری کو ہی بتائی تھی اور سب سے پہلے ان ہی کا مضمون مجھ تک پہنچا۔ ان کا مضمون کافی طویل ہے اور اہم بھی۔ انھوں نے افسانچے کے فروغ کے لیے کچھ مشورے بھی دیے ہیں، جو قابلِ غور ہیں۔

سرور غزالی نے اپنے مضمون میں افسانچہ نگاری کا جائزہ پیش کیا ہے اور تکنیک پر بھی

بات کی ہے۔وہ انھوں نے بڑے پتے کی بات کی ہے:

''افسانچہ لکھنا بڑے دل گردے کی بات ہے۔افسانچہ لکھنا کبھی بھی دانستہ یا شعوری عمل،یعنی اسے بنانا نہیں ہوتا۔بس خیالات کے پنچھی آئے، کچھ دیر ٹھہرے اور پھڑ پھڑ۔ بعد میں تخلیق کار سوچتا ہے یہ کیا تھا۔اتنی جلدی سب پر جھاڑ کر اڑ گئے۔''

رونق جمال اپنے مضمون میں بتاتے ہیں کہ افسانچہ کس طرح زندگی کے مسائل کا بوجھ اٹھاتا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''وقت کی کمی کی وجہ سے چاہے وہ کسی بھی زبان وادب کا قاری ہو ضخیم کتب اور ناولوں سے دوری بنانے پر مجبور ہو گیا ہے۔ان مجبور قارئین میں اردو زبان وادب کے قارئین بھی شامل ہیں۔ افسانچے کی ایجاد نے ادب میں کھلبلی سی مچا دی ہے۔افسانچے نے بہت تیزی سے مختصر وقت میں ادب میں اہم مقام پالیا۔اس لیے ادبا تو ادبا شعرا نے بھی افسانچے کی جانب توجہ دینا شروع کر دی تو ناقدین نے یہ سوال کھڑا کر دیا کہ اردو افسانچہ زندگی اور مسائل کتنا قریب ہے؟''

اس سلسلے کی ایک اور کڑی ارشد عبدالحمید کے تاثرات ہیں۔انھوں نے 'افسانے اور افسانچے کا فرق' سمجھایا ہے۔ان کی تحریر مختصر ہی سہی،لیکن بہت کارآمد ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''افسانچہ افسانے کی تصغیر ہے یعنی بہت چھوٹا سا افسانہ۔ہمیں علم ہے کہ افسانہ زندگی کے کسی ایک پہلو کی کسی چھوٹی سی بات کا اظہار کرتا ہے۔اس سے زیادہ کی گنجائش اس میں نہیں تو اندازہ لگائیں کہ افسانچے میں کتنی زندگی سما سکتی ہے۔''

محمد علی صدیقی نے افسانچے میں اختصار کا مطلب سمجھایا ہے۔انھوں نے اپنی بات کی ابتدا ان جملوں سے کی ہے:

"کہا جاتا ہے کہ اختصار افسانچے کی سب سے بڑی خوبی ہے۔لیکن صرف اختصار کہنا کافی نہیں ہے۔افسانچہ بھی افسانہ ہی ہے۔اس لئے ایک اچھے افسانچے میں اختصار کے ساتھ افسانے کے تمام عناصر کا موجود ہونا بھی ضروری ہے۔اختصار کا یہی عمل افسانچہ نگاری کو مشکل بناتا ہے۔رمزیت اور ایمائیت افسانچوں میں اختصار کے آلے کا کام کرتی ہیں۔"

افسانچے کے فن پر مختصر تاثرات میں افتخار امام صدیقی، نذیر فتح پوری، عارف خورشید، پروفیسر حمید سہروردی، جاوید نہال حشمی ، ریحان کوثر اور اسماعیل گوہر کے تاثرات شامل ہیں۔ ان سبھی قلم کاروں نے اختصار میں بڑی بڑی باتیں کہی ہیں۔ریحان کوثر نے اس ضمن میں بڑی اچھی اور نئی مثالیں پیش کی ہیں۔ان کی پیش کی ہوئی مثالیں اور دلیلیں متاثر کن ہیں اور اور افسانچہ اور فن افسانہ کو سمجھنے میں معاون بھی۔

محمد فاروق نے اپنے مضمون 'افسانچہ نگاری کے خد و خال' میں افسانچے کا سائز، موضوع، پلاٹ، منظر نگاری، جزئیات نگاری، کردار نگاری، مکالمہ نگاری، نقطۂ عروج، اختتام، زبان و بیان اور مختلف نکات کی روشنی میں اپنی بات رکھی ہے اور کچھ ضروری ہدایات بھی دی ہیں۔

اسی کے ساتھ ساتھ اس کتاب میں پرویز بلگرامی کا انٹرویو بھی شامل ہے۔جو راقم الحروف نے ہی لیا ہے۔اس انٹرویو سے ہندستان اور پاکستان میں افسانچے کی موجودہ صورت حال کا پتا چلتا ہے۔اس انٹرویو میں افسانچے کے فن پر بھی سوالات کیے گئے، جن کے جوابات موصوف نے اطمینان بخش دیے ہیں۔اسی کے ساتھ ساتھ اس گفتگو میں ڈیجیٹل پلیٹ فارم پر افسانچے کا سب سے پہلا یوٹیوب چینل 'دنیائے افسانچہ' پر بھی اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔

تقریباً سبھی مضامین کتاب کے مقصد میں معاون ثابت ہوتے ہیں، جن میں فنِ افسانچہ پر گفتگو کی گئی ہے۔ مختصر یہ کہ اس کتاب میں شامل مضامین کی مدد سے افسانچے کے فن کو بآسانی سمجھا جاسکتا ہے۔

افسانچے کے فن کے متعلق کچھ نظریات میرے بھی ہیں، جو میں نے اسی مقدمے میں بیان کیے ہیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ یہ کتاب نئے افسانچہ نگار اور وہ افسانچہ نگار جو کئی برسوں سے افسانچے لکھ رہے ہیں لیکن ابھی تک اس کے فن کو پوری طرح سمجھ نہیں پائے ہیں، کے لیے بھی مفید ثابت ہوگی۔

اردو افسانچہ: تعارف اور مباحث:

اردو میں سب سے پہلے افسانچے تحریر کرنے کا سہرا سعادت حسن منٹو کے سر جاتا ہے۔ وہ اردو افسانچہ نگاری کے موجد ہیں۔ ان کے افسانچوں کا مجموعہ ''سیاہ حاشیے'' اردو افسانچوں کا اولین مجموعہ ہے۔ 'سیاہ حاشیے' کی پہلی اشاعت اکتوبر 1948 میں ہوئی جس میں کل 32 افسانچے شامل ہیں۔ منٹو نے جب ''سیاہ حاشیے'' کے افسانچے لکھے اس وقت انھیں اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ وہ اردو میں ایک نئی صنف کا آغاز کر رہے ہیں اور اردو میں افسانچے کی بنیاد ڈال رہے ہیں۔ انھوں نے صرف تقسیم ہند اور فسادات سے متاثر ہو کر یہ افسانچے تحریر کیے۔ اس لیے ناقدین نے ''سیاہ حاشیے'' کے کچھ افسانچوں میں فنی لوازمات کی کمی کی شکایت بھی کی ہے۔

تیکھے موضوع، اختصار، زبان کی چابک دستی، کہانی پن اور غیر متوقع اختتام اچھے افسانچہ کی خوبیاں ہیں۔ افسانچہ ایک سطری، دوسطری سے ایک صفحے کا بھی ہوسکتا ہے۔ ایک یا دوسطری افسانچوں میں اکثر تشنگی باقی رہتی ہے اور وہ کامیاب افسانچے نہیں بن پاتے۔

منٹو کے افسانچے ''رعایت'' کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر اسلم جمشید پوری لکھتے ہیں:

''یہاں منٹو کی رعایتِ لفظی، فنی چابکدستی، موضوع پر گرفت،

عنوان کی برجستگی وغیرہ نے مل کر ایک ایسا فن پارہ گھڑا ہے کہ منٹو
کے قلم کے جادو کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔لفظوں میں سادگی ہے،
سلاست ہے،کوئی سنسنی خیزی نہیں،کوئی فحاشی نہیں،ظلم و زیادتی
کے ڈھول نہیں اور نہ ہی قاری کو دہشت زدہ کرنا مقصد ہے۔''

ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کی تحقیق کے مطابق ''سیاہ حاشیے'' کے عہد میں اردو میں لفظ ''افسانچہ'' رائج نہیں تھا۔افسانچے سے قبل ان کے لیے منی کہانی، مختصر ترین افسانہ، مختصر مختصر کہانی، منی افسانہ وغیرہ متعدد الفاظ استعمال کیے جاتے تھے۔لیکن جوگندر پال نے 1962 میں لفظ 'افسانچہ' کا استعمال کیا اور آج رائج لفظ 'افسانچہ' ان ہی کا عطا کردہ ہے۔

جوگندر پال اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''افسانچے کے اختصار کا اہم ترین پہلو یہی ہے کہ اس کے معانی
افسانچہ نگار کے دوٹوک فیصلے کی بجائے قاری کے تخلیقی تجسس سے
انجام پاتے ہیں۔''

زرگ افسانہ نگار رتن سنگھ نے افسانچوں کو عنوانات کی قید سے آزاد رکھا ہے۔'مانک موتی' ان کے افسانچوں کا مجموعہ ہے۔انھوں نے افسانچوں کو عنوان کے بجائے نمبر شمار دیا ہے۔وہ طوالت یا اختصار کے سبب کہانیوں کو خانوں میں تقسیم کرنا نہیں چاہتے۔

معروف فکشن نگار نورالحسنین کے الفاظ میں:

''افسانچہ نگاری پلاٹ اور خیالات کے بوجھ کے ساتھ ساتھ
لفظوں کے پل صراط سے گزرنے کا عمل ہے۔افسانچہ نگاری کا فن
دو دھاری تلوار پر چلنے کا عمل ہے۔ایک ایک لفظ کا انتخاب ایک
امتحان ہوتا ہے۔''

محمد بشیر مالیرکوٹلوی کہتے ہیں:

''ایک کامیاب افسانچہ، میں اسے ہی مانتا ہوں جسے پڑھ کر محسوس
ہو کہ اس افسانچہ کو بنیاد بنا کر ایک طویل افسانہ بھی تخلیق کیا جا سکتا
تھا۔''

ڈاکٹر اسلم جمشید پوری بھی محمد بشیر مالیر کوٹلوی کی اس بات سے متفق نظر آتے ہیں اور کہتے ہیں:

''افسانچہ کھیل تماشا نہیں ہے اور نہ ہی لطیفہ بازی بلکہ افسانچہ کا
موضوع بھرپور مواد کا تقاضا کرتا ہے۔ افسانچوں میں اضافی
خوبی کے طور پر طنز کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔''

ڈاکٹر عظیم راہی کے مطابق:

''افسانچہ زندگی کے کسی چھوٹے سے لمحے کی تصویر دکھا کر ایک
مکمل کہانی قاری کے ذہن میں شروع کر دینے کا نام ہے۔''

رونق جمال کی نظر میں:

''افسانچے کا اختتام دھماکہ خیز ہونا چاہیے۔ قاری کے ذہن میں
آخری جملہ کسی خطرناک بم دھماکے کی مانند گونجنا ہی افسانچے کی
کامیابی ہے۔''

اسی کے ساتھ وہ فلسفے، تیر ونشتر اور کہاوتوں کو افسانچوں کے نام پر شامل کرنے کی
مخالفت کرتے ہیں۔

معین الدین عثمانی فرماتے ہیں:

''کم سے کم لفظوں میں کسی واقعہ کو افسانوی لوازمات کے ساتھ
ہنرمندی سے برتنے پر افسانچہ وجود میں آ سکتا ہے۔''

سعادت حسن منٹو کے بعد صنف افسانچہ کے دامن کو تھامنے والا ایک اہم اور معتبر نام
جوگندر پال کا ہے۔ بعد ازاں رتن سنگھ، محمد بشیر مالیر کوٹلوی، ڈاکٹر ایم اے حق، ڈاکٹر عظیم

راہی، عارف خورشید، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، رونق جمال، ڈاکٹر نخشب مسعود، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، نذیر فتح پوری وغیرہ نے افسانچہ نگاری کو استحکام بخشا ہے۔ ڈاکٹر عظیم راہی ایک اچھے افسانچہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ افسانچے کی تنقید کے بنیاد گزار بھی ہیں۔ انھوں نے اپنی تصنیف ''اردو میں افسانچہ کی روایت: تنقیدی مطالعہ'' (2008) کے ذریعے افسانچے کی تنقید کی ابتدا کی اور محمد بشیر مالیرکوٹلوی نے 2015 میں ''افسانہ، افسانچہ تکنیکی تناظر میں'' کتاب لکھ کر افسانچے کی تکنیک سے روشناس کرایا۔

افسانچوں سے مجھے دلی لگاؤ ہے۔ اس لیے فنِ افسانچہ کی باریکیوں کو جاننے کی خواہش دل میں لیے، اپنے تشنہ لبوں کے ساتھ ایم اے حق صاحب سے موبائل پر دوران گفتگو میں نے افسانچے کے فن پر کرید کرید کر کئی سوالات کیے اور انھوں نے بھی ہر بار بڑے اچھے طریقے سے میرے ہر سوال کا جواب دیا اور میری الجھنیں دور کیں۔ واٹس ایپ پر میرے افسانچوں پر کھلے دل سے رائے دی ورنہ آج کل کے ادیب نئے لکھنے والوں سے بات کرنا بھی کہاں پسند کرتے ہیں؟ جو ادیب نئے لکھنے والوں کو نظر انداز کرتے ہیں وہ شاید یہ بھول جاتے ہیں کہ غالب کی شہرت میں سب سے بڑا ہاتھ ان کے شاگردوں کا ہی رہا ہے۔

ایم اے حق صاحب سے موبائل پر متعدد مرتبہ دوران گفتگو افسانچے کے فن کے متعلق کیے گئے سوالات کے جوابات کا ماحصل یہ ہے کہ اختصار افسانچے کی خوبی، طوالت افسانچے کی موت اور منظر کشی افسانچے کی دشمن ہے۔ افسانچے کی شروعات ایسی ہو کہ قاری مطالعہ کرنے کے لیے مجبور ہو جائے۔ الفاظ، جملوں اور مکالموں کی تکرار نہ ہو بلکہ نپے تلے ہوں۔ اختصار اتنا زیادہ بھی نہ ہو کہ ابہام پیدا ہو جائے اور طوالت اتنی زیادہ بھی نہ ہو کہ ہر بات کھل کر بیان کر دی جائے۔ افسانچہ ایک سطری بھی ہو سکتا ہے اور دو صفحات کا بھی۔ گھسے پٹے واقعات سے دامن بچانا بھی ضروری ہے۔ افسانچوں کے عنوانات دور حاضر کے مسائل اور حالات زندگی پر مبنی ہوں۔ عنوان سے کلائمکس کا پتا نہ چلنے پائے۔ کلائمکس چونکا دینے والا ہو۔

لوگوں میں ذہانت کی سطح کافی اونچی ہوتی جارہی ہے اور ایک مشہور کہاوت ہے کہ 'عقل مند کے لیے اشارہ کافی ہوتا ہے' اور اشارہ ہمیشہ مختصر ہی ہوتا ہے۔ فرض کیجیے آپ ٹرین میں سفر کر رہے ہیں۔ آپ کے پاس افسانوں کی کتاب ہے۔ آپ کے مقابل میں ایک ایسا شخص بیٹھا ہوا ہے جو ادب و مطالعے سے بے بہرہ ہو۔ وہ شخص کتاب اٹھائے گا، دس صفحات کے ایک افسانے پر نظر دوڑائے گا اور واپس رکھ دے گا۔ اس کے برعکس اگر آپ کے پاس افسانچوں کی کتاب ہوگی تو وہ اسی وقت دو تین افسانچے پڑھ ہی لے گا، پڑھ کر لطف اندوز ہوگا، رفتہ رفتہ مطالعے کا شوق پیدا ہوگا اور وہ افسانوں کی طرف راغب بھی ہوسکتا ہے۔ اس طرح افسانچہ ادب کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کرتا ہے ورنہ ادبی ذوق رکھنے والے تو ادب کے مطالعے سے اپنی پیاس بجھا ہی رہے ہیں۔ افسانچہ دراصل افسانے کی بونسائی (Bonsai) شکل ہے۔ پلاٹ، کردار، مکالمے، کلائمکس، پیغام وغیرہ اجزائے ترکیبی کو افسانچے میں بڑی مہارت کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے۔ آج افسانچہ وقت کی ضرورت ہے اور یہ صنف دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہی ہے۔

یہاں میں ایم اے حق صاحب کی تمام باتوں سے اتفاق کرتا ہوں لیکن ان کی ایک بات، جس پر مجھے اختلاف ہے وہ یہ ہے کہ ''افسانچہ ایک لائن کا بھی ہوسکتا ہے اور دو صفحات کا بھی۔''

میں سمجھتا ہوں دو صفحات کا افسانچہ نہیں، افسانہ ہوتا ہے۔ افسانچہ کتاب کے جس صفحہ پر شروع ہوا ہو، اسی صفحہ پر اسے ختم ہو جانا چاہیے، تب ہی وہ افسانچہ ہوگا۔ اگر وہ ایک صفحہ سے زیادہ بڑھ جاتا ہے تو پہلے وہ منی کہانی اور اس کے بعد افسانہ ہو جائے گا۔ بہر حال یہ موضوع بڑا پیچیدہ ہے اس لیے اس پر الگ سے گفتگو کی جائے گی۔ مختلف افسانچہ نگاروں اور افسانچہ ناقدین کے ذریعے کی گئیں افسانچے کی تعریفوں میں سے میں ڈاکٹر عظیم راہی کی تعریف کو زیادہ بہتر سمجھتا ہوں اور اسی سے متاثر ہو کر میں افسانچے کی تعریف اس طرح کروں گا:

''اختصار، رعایت لفظی، اور غیر متوقع اختتام کے ساتھ ایک جھلک دکھا کر ایک طویل

کہانی، قاری کے ذہن میں شروع کر دینے والی تحریر کو افسانچہ کہتے ہیں۔‘‘

افسانچے کا سب سے بڑا هیرو:

منٹو نے فسادات کے زیر اثر افسانچے لکھے۔ سیاہ حاشیے میں 32 افسانچے ہیں۔ سبھی افسانچوں میں فسادات کی ہول ناک کہانیاں بیان کی گئی ہیں۔ بعض لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ منٹو نے منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے افسانچے لکھے، اگر وہ باقاعدہ افسانچہ نگاری کرتے تو ان کے ایک سے زیادہ مجموعے شائع ہوتے۔ یہ بات کس حد تک صحیح ہے یہ تو ایک راز ہے اور راز ہی رہے گا۔ کیوں کہ منٹو تو بتانے کو آنے والے نہیں اور قیاس آرائیاں جاری رہیں گی۔ لیکن اس بات کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ منٹو ہی وہ قلم کار تھے جنھوں نے اردو میں سب سے پہلے افسانچے کا پہلا پتھر پھینکا تھا۔ اگر وہ پہلا پتھر نہ مارتے تو شروعات ہی نہ ہوتی۔

منٹو کے بعد جوگندر پال نے اس صنف کو استحکام بخشا۔ افسانچے کے فروغ میں سب سے بڑا تعاون جوگندر پال کا ہی ہے۔ منٹو تو پہلا پتھر پھینک چکے تھے۔ انھوں نے یہ پہلا پتھر انجانے میں پھینکا تھا یا سوچ سمجھ کر، یہ تو راز کی بات ہے جو راز میں ہی رہے گی۔ چلیے فرض کر لیتے ہیں کہ یہ پہلا پتھر منٹو نے انجانے میں پھینک دیا تھا اور انھیں اس بات کا احساس بھی نہیں تھا کہ وہ اردو میں ایک نئی صنف کی بنیاد ڈال رہے ہیں۔ لیکن اس کے بعد جوگندر پال کا رول اس صنف کو زندگی دینے میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ انھوں نے باقاعدہ افسانچے لکھے اور خوب لکھے۔ انھیں کتابی شکل میں شائع کیا۔ ان کے افسانچوں کے ایک سے زائد مجموعے شائع ہوئے۔ انھوں نے دوسرے قلم کاروں کو بھی افسانچہ نگاری کی ترغیب دی۔ افسانچہ نگاری کے ضمن میں جوگندر پال کا کام بڑا اہم ہے۔

آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ نئی نئی اصناف ادب ایجاد ہو رہی ہیں لیکن وہ اپنے موجد کے ساتھ ہی دم توڑ دیتی ہیں۔ کیوں کہ انھیں ابھی تک کوئی جوگندر پال نہیں ملا۔ اس لیے میں افسانچے کا سب سے بڑا ہیرو جوگندر پال کو سمجھتا ہوں۔

افسانچہ کیا ہے؟

افسانچہ کیا ہے؟ ایک جھلک دکھا کر ایک مکمل کہانی، قاری کے ذہن میں چلا دینے کا نام افسانچہ ہے۔ افسانچہ ختم ہوتا ہے اور قاری کے ذہن میں ایک مکمل کہانی چل پڑتی ہے۔ جس افسانچے کو پڑھ کر قاری تھوڑا ٹھہر جائے، اس کے چہرے کے تاثرات بدل جائیں اور وہ تھوڑی دیر سوچنے پر مجبور ہو جائے تو سمجھ لیجیے وہ کامیاب افسانچہ ہے۔

کہانی پن:

افسانچہ کی سب سے پہلی شرط یہی ہے کہ اُس میں ایک کہانی بیان کی گئی ہو۔ آج کل ایسے افسانچے زیادہ تعداد میں نظر آتے ہیں جن میں کہانی پن کا فقدان صاف صاف نظر آتا ہے۔ ان میں ڈھونڈنے سے بھی کہیں کہانی نہیں ملتی۔ وہ افسانچے نہیں ہوتے، خیالات ہوتے ہیں، لطیفہ ہوتے ہیں، اقوال ہوتے ہیں یا محض نثر کے ٹکڑے ہوتے ہیں۔

افسانچے کا اختتام:

افسانچے میں اختتام کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ جب کہانی بیان ہوئی ہے تو اس کا اختتام بھی ہوگا۔ اور ایسا بھی نہیں کہ ہر افسانچے کا اختتام چونکانے والا ہو، لیکن سوچنے پر مجبور کرنے والا ضرور ہو۔

جس افسانچے کا اختتام پھسپھسا ہوگا وہ افسانچہ ایک نثری اقتباس ہو کر رہ جائے گا۔ کچھ افسانچے تو وعظ و نصیحت کا محض ٹکڑا معلوم ہوتے ہیں اور کچھ کی حیثیت اقوال سے آگے بڑھ نہیں پاتی۔

اشارے و کنایے:

کچھ افسانچہ نگاروں نے ایسے افسانچے تحریر کیے ہیں کہ سب کچھ انھوں نے ہی کہہ دیا ہے۔ افسانچہ نگار کو چاہیے کہ قاری و نقاد کے لیے بھی کچھ چھوڑ دے۔ اسی لیے افسانچہ ایسا نہ ہو کہ سب کچھ کھل کر بیان کر دیا جائے۔ کچھ باتیں پردے میں، اشاروں کنایوں میں بیان

کی جانی چاہئیں تا کہ جب کوئی نقاد اس پر تنقید یا اس کا تجزیہ کرے تو وہ اس کا پردہ اٹھائے۔

اختتامی فیصلہ:

افسانچہ نگار کو چاہیے کہ وہ کوئی فیصلہ نہ سنائے۔ کچھ افسانچہ نگار افسانچے کے آخر میں وضاحت کرنے لگتے ہیں، تقریر کرنے لگتے ہیں۔ افسانچہ نگار کو فیصلہ نہیں سنانا ہے، صرف کہانی بیان کرنا ہے۔ کہانی ختم ہونے کے ساتھ ہی افسانچہ نگار کا کام ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد قاری و نقاد کا کام شروع ہوتا ہے۔ قاری و نقاد اپنے حساب سے اسے سمجھیں گے، وضاحت تبصرہ و تجزیہ کریں گے۔

ذہنی مشق اور تجربہ:

افسانچہ محض ذہنی مشق نہ ہو۔ کچھ افسانچے ایسے ہوتے ہیں جو محض ذہنی مشق یا مکمل تخیل کی بنا پر لکھے جاتے ہیں۔ تخلیق میں تخلیق کار کا تجربہ جھلکنا چاہیے۔ جو تخلیق بنا کسی تجربے کی بنیاد پر لکھی جاتی ہے۔ اس میں کئی قسم کی خامیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

موضوعات:

نیا دور اپنے ساتھ نئی چیزیں لایا ہے۔ انٹرنیٹ، سوشل میڈیا اور جدید ٹیکنالوجی نے زندگی کو آسان بنایا ہے تو مشکلات بھی کھڑی کی ہیں، مسائل بھی پیدا کیے ہیں۔ جہاں اس کے فائدے ہیں تو وہیں نقصانات بھی ہیں، جن سے تخلیق کاروں کو نئے موضوعات ملے ہیں۔

موضوعات کے متعلق ہم اکثر سنتے ہیں کہ وہ نئے اور اچھوتے ہونے چاہئیں، لیکن ان کا تعلق مسائل سے ہوتا ہے۔ جو مسئلہ آج سماج کو درپیش ہے، اس پر لکھا جانا چاہیے۔ مثال کے طور پر جہیز کا مسئلہ بہت پرانا ہے۔ یہ کل بھی تھا اور آج بھی ہے۔ حالانکہ جہیز کے مسئلے پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ اب اس پر کچھ لکھا نہ جائے کیوں کہ یہ مسئلہ ابھی ہمارے درمیان ختم نہیں ہوا ہے۔ اس لیے اس موضوع پر لکھا جا سکتا ہے اور لکھا جانا چاہیے۔ لیکن پرانے موضوعات پر قلم اٹھانا اس وقت زیادہ بہتر ثابت ہوگا جب آپ کا

اسلوب، پیش کش کا طریقہ مؤثر اور دوسروں سے مختلف ہوگا۔

رباعی کا آخری مصرع:

افسانچے کی پنچ لائن یا اس کا اختتام رباعی کے آخری مصرعے کی طرح ہوتا ہے جو پورے افسانچے کا نچوڑ ہوتا ہے۔ جو بات اب تک راز میں تھی، پردے میں تھی، افسانچے کی پنچ لائن اس راز سے پردہ اٹھا دیتی ہے۔

دیگر اجزائے ترکیبی:

افسانچے میں، کہانی پن، مکالمے، منظر نگاری، کردار نگاری سب کچھ ہوتے ہیں، لیکن ضروری نہیں کہ یہ تمام اجزا ایک افسانچے میں موجود ہوں۔ افسانچے کی سب سے پہلی شرط یہی ہے کہ اس میں کہانی بیان کی گئی ہو۔ افسانچے میں مکالمے بھی ہوتے ہیں لیکن نہایت ہی نپے تلے۔ افسانچے میں جہاں ضرورت ہو وہاں منظر نگاری بھی ہوتی ہے۔ لیکن وہ منظر نگاری نہایت ہی جامع اور مختصر ہوتی ہے۔ افسانچے میں کردار نگاری کے نام پر صفحے کے صفحے سیاہ نہیں کیے جاتے بلکہ کرداروں کے حرکت وعمل سے ان کی شخصیت کو سمجھا جاتا ہے۔

افسانچے کی طوالت:

افسانچے کی مقبولیت میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ رسائل واخبارات نہایت ہی اہتمام سے افسانچے شائع کر رہے ہیں۔ ماہنامہ 'شاعر' (ممبئی) جیسے معتبر رسالے نے افسانچے کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس فن کو کچھ لوگوں نے جتنا آسان سمجھ لیا ہے، اتنا ہے نہیں۔ افسانچہ تحریر کرنا بڑی مہارت کا کام ہے۔ جلد بازی اس صنف کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔ کچھ لوگ افسانچے کے نام پر الم غلم لکھ رہے ہیں۔

افسانچے کی طوالت کے متعلق مختلف نظریات ملتے ہیں۔ افسانچہ یک سطری بھی ملتا ہے اور دو صفحات کا بھی۔ افسانچہ دراصل چھوٹا افسانہ ہی ہوتا ہے۔ اس کے اجزائے ترکیبی وہی ہیں جو افسانے کے ہیں۔ لیکن ضروری نہیں کہ ایک افسانچے میں سبھی اجزا استعمل ہوں۔

افسانچے میں منظر نگاری اور جزئیات نگاری بھی ہوتی ہے، لیکن نہایت ہی مختصر و جامع اور نپے تلے انداز میں۔ افسانچے میں اس بات پر زیادہ زور دیا جاتا ہے کہ اس کا اختتام چونکانے والا ہو، طنزیہ ہو، اور یہی اس کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

معروف افسانہ نگار محمد بشیر مالیرکوٹلوی اپنی تصنیف 'افسانہ، افسانچہ تکنیکی تناظر میں' میں لکھتے ہیں:

''میرے نزدیک کامیاب افسانچے کی خوبی یہی ہونی چاہیے کہ وہ قاری کو اپنی ننھی ہیئت سے جھنجھوڑ کر رکھ دے۔ پٹاخہ چھوٹی سی چیز ہوتی ہے مگر جب وہ پھٹتا ہے تو اپنے اردگرد کے ماحول کو ہلا کر رکھ دیتا ہے۔''

افسانچے کی طوالت کے متعلق وہ فرماتے ہیں کہ افسانچہ ایک نازک صنف ہے جو لفظوں کا زیادہ بوجھ اٹھا نہیں سکتی۔ انھوں نے نہ تو دو صفحے کے افسانچے لکھے ہیں نہ ہی وہ اس کے حق میں ہیں۔ دوران گفتگو انھوں نے بتایا کہ افسانچہ دراصل چھوٹا افسانہ ہوتا ہے۔ جس طرح کتاب سے کتابچہ، صندوق سے صندوقچہ اسی طرح افسانے سے افسانچہ۔ چیز وہی لیکن سائز چھوٹی۔ ''افسانچہ'' میں سات حروف ہوتے ہیں اس لیے افسانچہ سات سطروں پر مشتمل ہونا چاہیے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ بات بن نہیں پا رہی ہے تو زیادہ سے زیادہ دس سطریں اور کم سے کم پانچ سطریں ہونی چاہئیں۔ دو صفحے کا تو افسانچہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ایک سے دو صفحے 'منی کہانی'، دو سے بارہ صفحے 'افسانہ' اور بارہ سے زیادہ 'طویل افسانہ' ہوتا ہے، اس طرح میں مانتا ہوں ایک سطر کا افسانچہ نہیں ہوتا۔ ایک سطر کا صرف جملہ ہوتا ہے۔ بہتر افسانچہ وہی قلم کار لکھ سکتا ہے جو افسانے کے تمام رموز سے واقف ہو۔ افسانچہ سمندر کو کوزے میں بند کرنے کا نام ہے۔ شرط یہ ہے کہ جب کوزہ کھلے تو سمندر نظر آئے۔

البتہ ڈاکٹر ایم اے حق دو صفحے کے افسانچے کے حق میں نظر آتے ہیں اور انھوں نے تحریر

بھی کیے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں، دو صفحے کا افسانچہ بھی ہو سکتا ہے اور ایک صفحے کا افسانہ بھی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ افسانے میں منظر نگاری اور جزئیات نگاری ہوتی ہے لیکن افسانچے میں نہیں۔

اس ضمن میں پروفیسر اسلم جمشید پوری فرماتے ہیں کہ افسانچے کے تعلق سے بہت زیادہ اختلافات ہیں۔ خاص کر افسانچے کی ہیئت کو لے کر آج تک کوئی قابل قبول رائے نہیں ملتی۔ ادب میں داستان، ناول، ناولٹ، افسانہ، افسانچہ، کسی بھی نثری صنف کی طوالت طے نہیں ہے۔ اختصار، جامعیت، طنز اور قصہ پن افسانچے کی خوبیاں ہیں۔ اب وہ چار، چھ، دس سطروں کا ہو یا ایک ڈیڑھ صفحے کا۔ ڈاکٹر عظیم راہی اپنی تصنیف 'اردو میں افسانچہ کی روایت' میں لکھتے ہیں:

''افسانچہ ادب کی وہ نثری صنف ہے، جس میں کم سے کم لفظوں میں کم سے کم سطروں میں ایک طویل کہانی کو مکمل کر لیں۔ چونکہ ناول، افسانہ اور افسانچہ کا فرق پہلے ہی اس طرح بتایا گیا ہے کہ ناول پوری زندگی کی عکاسی کرتا ہے جب کہ افسانہ زندگی کے صرف ایک پہلو پر روشنی ڈالتا ہے اور افسانچہ زندگی کے کسی چھوٹے سے لمحے کی تصویر دکھا کر ایک مکمل کہانی قاری کے ذہن میں شروع کر دینے کا نام ہے۔''

ڈاکٹر عظیم راہی افسانچہ اور منی افسانہ میں فرق کرنے کے قائل نہیں ہیں۔ وہ مانتے ہیں کہ افسانچہ یک سطری بھی ہو سکتا ہے اور دو صفحے کا بھی۔ لیکن اختصار پر ہی زور دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''بہر حال یہ امر تخلیق کار کی مشاقی کا مظہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے موضوع کو کس حد تک مختصر انداز میں مگر مکمل طور پر پیش کر سکتا ہے۔''

افسانچے کی ہیئت اور کہانی پن کے تعلق سے ڈاکٹر ریاض توحیدی اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''افسانچے کو اگر افسانے کا بچہ تصور کیا جائے تو ایک بڑے انسان

کی طرح بچے کا ڈھانچہ تو ہونا ہی چاہیے۔ البتہ یہ دوسری بات ہے کہ اس کا قد کاٹھ ابھی کتنا ہے لیکن آنکھ، ناک، ہاتھ پیر وغیرہ کا ہونا تو ضروری ہے۔ یا ہم کسی کو بچے کی ناک یا آنکھ یا بازو دکھا کر کہیں کہ یہ ہے بچہ ... ؟ افسانچے میں بڑے افسانے کی چھوٹی ہیئت ہونی چاہیے اور پھر چاہے آنکھ یا ناک پر ہی کیوں نا فوکس کیا گیا ہو۔ افسانچہ دس پندرہ سطور سے ایک آدھ صفحے تک کا ہو سکتا ہے، تاہم اس کو پڑھنے کے بعد ایک مختصر کہانی سامنے آتی ہو۔ یک سطری، دو سطری تصورات افسانچے کے زمرے میں نہیں آسکتے ہیں۔''

مذکورہ گفتگو کی اہمیت و افادیت کے پیش نظر میں یہ اضافہ کرنا چاہوں گا کہ افسانچہ کتاب (ڈیمائی 8 /1) کے جس صفحے پر شروع ہو، اسی پر ختم ہو جانا چاہیے۔ اگر وہ دو صفحات تک پھیل جائے گا تو منی افسانہ ہو جائے گا۔ محمد بشیر مالیر کوٹلوی کے پانچ سے دس سطور والے نظریے سے میں جزوی طور پر متفق ہوں کیوں کہ افسانچے ہوں یا کوئی اور تخلیق اس میں سبھی سطریں یکساں نہیں ہوتیں۔ مکالموں میں سطریں کبھی مکمل تو کبھی نہایت ہی چھوٹی ہوتی ہیں۔ ہاں الفاظ کے حساب سے اگر دیکھا جائے تو افسانچے کو زیادہ سے زیادہ تین سو الفاظ کے آس پاس ہونا چاہیے۔ کم سے کم کی میں کوئی حد نہیں بتا سکتا۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ افسانچہ ختم کرنے کے بعد تشنگی باقی نہ رہے۔

اس معاملے میں، میں ڈاکٹر عظیم راہی سے اتفاق کرتا ہوں کہ یہ افسانچہ نگار کی مشاقی کا مظہر ہوگا کہ وہ اپنے افسانچے کو کس حد تک مختصر اور مکمل طور پر پیش کرے گا۔ افسانچے کی طوالت پر بات کرنے کی ضرورت اس لیے بھی محسوس ہوئی کیوں کہ ہم دیکھ رہے ہیں، دن بہ دن افسانہ مختصر اور افسانچہ طویل ہوتا جا رہا ہے۔ مستقبل میں یہ خطرہ لاحق ہے کہ یہ دونوں اصناف ایک

دوسرے میں خلط ملط نہ ہو جائیں کیونکہ دونوں ہی اصناف ہر خاص و عام میں یکساں طور پر نہ صرف مقبول ہیں بلکہ ترقی پذیر بھی ہیں۔

افسانچہ اور لطیفہ:

کیا جب کوئی کہانی کسی المیہ پر ختم ہوگی تب ہی ہم اسے افسانچہ یا افسانہ تسلیم کریں گے؟ کیا کسی کہانی کا خوشگوار اختتام نہیں ہو سکتا؟ کیا ہم قاری کو خوف زدہ کرنا چاہتے ہیں؟ دراصل ہم روایتوں کے غلام ہیں۔ افسانے والے افسانچے کو پسند نہیں کرتے۔ افسانچے والے کوئی نیا تجربہ قبول نہیں کرتے۔ تقریباً ہر تخلیق میں کچھ نہ کچھ نقص نکالا جا سکتا ہے اور یہ اس وقت تک ہوتا رہے گا جب تک نقاد کہانی میں پیش کیے گئے واقعے کو صرف اپنی ذات کی حد تک سوچے گا۔ کیا ہم نہیں جانتے کہ آج سماج میں میں کیا کچھ نہیں ہو رہا ہے!!!

عام طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ جس واقعے کو پڑھ کر ہنسی آجائے یا لبوں پر مسکراہٹ پھیل جائے وہ لطیفہ ہوتا ہے۔ اس کے متعلق ایک مثال دیکھتے ہیں کہ ایک شخص راستے سے چل رہا ہے اور چلتے چلتے اس کا پیر کیلے کے چھلکے یا کسی دوسری چکنی چیز پر پڑتا ہے اور وہ شخص دھڑام سے زمین پر گر جاتا ہے۔ جسے دیکھ کر بہت سے لوگوں کو ہنسی آجاتی ہے۔ تو کیا یہ لطیفہ ہے؟ یہ ہنسنے کا مقام نہیں، ہنسنے والوں پر افسوس کا مقام ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہنسنے کی بجائے دوڑ کر اس شخص کو اٹھایا جاتا۔ اس لیے کوئی افسانچہ پڑھ کر اگر ہمارے چہرے پر مسکراہٹ آ بھی جاتی ہے تو اسے لطیفہ کہنے سے پہلے اس واقعے کی گہرائی کو، نفسیاتی گتھی کو اور پوشیدہ پیغام کو ہمیں سمجھنا ہوگا۔

افسانچہ اور غزل:

شاعری میں جو حیثیت غزل کی ہے نثر میں وہی حیثیت میں افسانچے کی سمجھتا ہوں۔ غزل میں ہر قسم کے موضوع کو اپنانے کی صلاحیت ہے۔ اسی طرح افسانچے میں بھی ہر قسم کے موضوعات بیان کیے جا سکتے ہیں اور بیان کیے جا رہے ہیں۔ میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ

شاعری کی مختلف اصناف میں غزل اتنی مقبول کیوں ہے؟ تو میرے ذہن میں یہی بات آتی ہے کہ اس کے اختصار نے اسے مقبول بنایا ہے۔ مثنوی، قصیدہ اور نظم کے مقابلے میں غزل مختصر ہوتی ہے۔ غزل کے اختصار کا عالم تو یہ ہے کہ اس کا ہر شعر معنی و مفہوم کے اعتبار سے ہر دوسرے شعر سے مختلف اور اپنے آپ میں مکمل ہوتا ہے۔

اسی طرح نثری اصناف میں ناول اور افسانہ کے مقابلے افسانچہ مختصر ہوتا ہے۔ جو آج کی ضرورت بھی ہے اور اسی سبب یہ کافی مقبول بھی ہو رہا ہے۔ غزل کے ہر شعر میں ایک احساس، ایک خیال، ایک واقعہ پیش کیا جاتا ہے۔ افسانچے میں بھی زندگی کی مختصر سی تصویر ہی دکھائی جاتی ہے۔ غزل کا ہر شعر اپنے اندر گہری معنویت رکھتا ہے۔ اسی طرح ہر افسانچہ ایک طویل افسانہ ہوتا ہے۔ افسانچہ کاغذ پر ختم ہوتا ہے اور قاری کے ذہن میں شروع ہو جاتا ہے۔

اپنے ایک مضمون ''سوشل میڈیا اور اردو افسانہ'' سے ایک اقتباس یہاں پیش کرتا ہوں:

> ''زمانہ بڑی تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔ نئی نئی چیزیں ایجاد ہو رہی ہیں۔ لوگ ان چیزوں سے فیض یاب ہو رہے ہیں۔ وقت تبدیلی کا مظہر ہے اور تبدیلی زندگی کی علامت ہے۔ یہ ایک مستقل عمل ہے جو ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ زیادہ دور نہیں جاتے اکبر بادشاہ کے زمانے کی ہی بات کرتے ہیں، اس وقت اگر کوئی ویڈیو کالنگ کی بات کرتا اور کہتا کہ دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے پر موجود دو اشخاص ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے بات کریں گے تو اسے پاگل خانے بھیج دیا جاتا۔ ٹیکنالوجی کے اس دور میں اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ادب بھی جدید ٹیکنالوجی سے متاثر ہوگا اور اس بات میں کوئی شک نہیں کہ آنے والا وقت آڈیو/ ویڈیو کتابوں کا ہے۔''

یہ اختصار کا دور ہے۔ فرصت کے لمحات موبائل کی اسکرین کو ٹچ کرتے ہوئے نہ جانے کب گزر جاتے ہیں، پتہ ہی نہیں چلتا۔ تبدیلی زندگی کی علامت ہے۔ یہ داستانوں کا دور نہیں، جب انسان کے پاس فرصت ہی فرصت ہوا کرتی تھی۔ دنیا بدل چکی ہے اور انسان بھی اس کے مطابق اپنے آپ کو بدل رہا ہے۔ آج جتنے افسانچے لکھے اور پڑھے جا رہے ہیں اسے دیکھتے ہوئے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ افسانچہ بہت جلد نثر میں سب سے مقبول و متمول صنف کی حیثیت اختیار کر لے گا، جیسے شاعری میں غزل کا مقام ہے۔

افسانچے میں افسانویت:

افسانچے میں بھی افسانویت ہوتی ہے لیکن یہ عنصر سبھی افسانچوں میں نہیں ہوتا۔ جو افسانچے 300 یا 350 الفاظ پر مشتمل ہوتے ہیں یا ڈیمائی ۸/۱ سائز کی کتاب کے ایک صفحے پر پورے طور پر پھیل جاتے ہیں ان میں افسانویت ہو سکتی ہے۔ افسانچے میں افسانویت لانا افسانچہ نگار کی اپنی مہارت پر منحصر ہے۔ نہایت ہی مختصر افسانچوں میں یہ عنصر بالکل بھی نہیں ہوتا۔ ایسے افسانچے جو چار پانچ سطروں پر یا سو، پچاس الفاظ پر منحصر ہوتے ہیں ان میں افسانویت پیدا نہیں کی جا سکتی۔

جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ کامیاب افسانچے کی سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ اس میں کہانی پن ہو۔ جو افسانچہ بیان کیا گیا ہے اس میں ایک کہانی بھی ملتی ہو۔ اس کے بعد دوسرے عناصر آتے ہیں، جیسے تجسس، کلائمکس وغیرہ۔ افسانچہ اتنا مختصر بھی نہ ہو کہ تشنگی باقی رہے اور اتنا طویل بھی نہ ہو کہ افسانہ بن جائے۔ افسانچے کی طوالت اتنی ہو کہ وہ ڈیمائی ۸/۱ سائز کی کتاب کے جس صفحے پر شروع ہوا ہو اسی پر ختم ہو جائے۔ شروع سے آخر تک تجسس برقرار رہے جو کلائمکس پر ہی ختم ہو۔ افسانچے میں بھی افسانویت ہوتی ہے لیکن یہ خوبی سبھی افسانچوں میں نہیں ہو سکتی۔

ادب میں شناخت کا مسئلہ:

آج کل یہ بھی سننے میں آ رہا ہے کہ ایک افسانچہ نگار کو ادب میں اپنی شناخت بنانے کے لیے صرف افسانچہ نگاری پر ہی اتفاق نہیں کرنا چاہیے۔ اسے افسانے اور ناولز بھی لکھنے چاہئیں، تب جا کر وہ ادب میں اپنی شناخت بنا پائے گا۔ مجھے اس بات سے اختلاف ہے۔ میں مانتا ہوں کہ ایک افسانچہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ افسانے اور ناولز سمجھ کر پڑھے۔ پڑھنے اور سمجھ کر پڑھنے میں بڑا فرق ہے۔ ایک فن کار کو اچھا افسانچہ نگار بننے کے لیے اور اچھے افسانچے تخلیق کرنے کے لیے افسانوں اور ناولوں کا سمجھ کر مطالعہ کرنا اشد ضروری ہے۔ اب رہی بات ادب میں شناخت کی تو افسانچہ نگاری ایک نشہ ہے اور ایک نشہ باز کبھی بھی یہ سوچ کر نشہ نہیں کرتا کہ اسے فائدہ ہوگا یا نقصان۔ وہ تو بس اپنی دھن میں رہتا ہے۔ یہ مثال افسانچہ نگار پر صادق آتی ہے۔

جو تخلیقی کام نہایت سوچ سمجھ کر، مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے، منصوبہ بند طریقے سے کیا جاتا ہے، اس کام سے، کام کرنے والا فائدے کی امید رکھتا ہے۔ لیکن افسانچے کا معاملہ کچھ الگ ہے۔ افسانچہ تخلیق نہیں کیا جاتا، وہ ہو جاتا ہے۔ جس طرح شعر بنایا نہیں جاتا، وہ ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی ایک افسانچے میں تمام فنی لوازمات موجود نہ ہونے کے باوجود بھی وہ اپنے اندر ایک طویل داستان رکھتا ہے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں ایک افسانچہ نگار کے سامنے ادب میں اپنی شناخت کا مسئلہ ہرگز نہیں ہے۔ افسانچہ نگار نہ تو ستائش کی تمنا رکھتا ہے نہ ہی صلے کی۔ وہ تو بس اپنی افسانچہ نگاری میں مگن رہتا ہے۔ محمد بشیر مالیرکوٹلوی کہتے ہیں کہ فن کار بنائے نہیں جاتے، پیدا ہوتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح کوئی بھی فن پارہ بنایا نہیں جاتا، وہ تخلیق کار پر اترتا ہے۔

آخر کون ہیں یہ لوگ؟

جب کچھ لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنتا ہوں کہ افسانچہ ابھی تک بطورِ صنف قبول نہیں کیا

گیا ہے تو مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے کہ کس بنا پر یہ لوگ کہتے ہیں کہ افسانچے کو ابھی تک بطورِ صنف شرفِ قبولیت حاصل نہیں ہوا ہے۔ پھر میرے ذہن میں یہ سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ یہ فیصلہ کون سنا رہا ہے؟ یہ سرٹیفیکیٹ کون بانٹ رہا ہے؟ آخر کون ہیں یہ لوگ؟ میں تو دیکھ رہا ہوں کہ یہ صنف بڑی تیزی سے ترقی کر رہی ہے۔ رسائل واخبارات میں افسانچے تواتر سے شائع ہور ہے ہیں۔ قلم کار افسانچے لکھ رہے ہیں، قارئین بڑے شوق سے پڑھ رہے ہیں اور لطف اندوز ہور ہے ہیں۔ یونیورسٹیز میں اس پر مقالے لکھے جا چکے ہیں اور لکھے جا رہے ہیں۔ اخبارات ورسائل میں اس صنف پر مضامین شائع ہور ہے ہیں۔ یہ قارئین کی پسندیدہ صنف بن گیا ہے۔ ہندوستان کا سب سے قدیم اور معتبر رسالہ 'شاعر' نہایت ہی تزک واحتشام سے افسانچے شائع کرتا ہے۔ ملک اور بیرونِ ملک کے رسائل میں افسانچہ نگاری پر گوشے شائع ہو چکے ہیں اور ہور ہے ہیں۔ اور کیا چاہیے سرٹیفیکیٹ بانٹنے والوں کو؟ میں سمجھتا ہوں جو صنف عوام میں مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔ اب اسے کسی سے سرٹیفیکیٹ لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ کچھ رسائل افسانچے شائع نہیں کرتے۔ لیکن ایسے رسائل کی تعداد کتنی ہیں؟ ایک واقعہ یاد آ گیا۔ ایک رسالے کے مدیر نے مجھے بتایا تھا کہ اپنے رسالے میں وہ افسانچے شائع نہیں کرتے لیکن ان پر مضامین شائع کرتے ہیں۔ دیکھیے، یہ امر باعثِ تعجب ہے کہ نہیں؟

ایک واقعہ:

ایک دفعہ واٹس ایپ پر ایک صاحب نے مجھ سے یہ سوال کیا کہ افسانچہ اگر ایک صنف ہے تو اس کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟ میں نے جواب دیا، طوالت کو چھوڑ کر وہی سب ہیں جو افسانے کے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے اگلا سوال کیا کہ افسانچہ جب ایک الگ صنف ہے تو اس کے اجزائے ترکیبی افسانے کے اجزائے ترکیبی سے ملتے جلتے کیوں ہیں؟ تب میں نے ان سے یہ سوال کیا کہ افسانے کے اجزائے ترکیبی ناول کے اجزائے

ترکیبی سے ملتے جلتے کیوں ہیں؟ اب اس کے بعد آگے کیا ہوا ہوگا یہ ایک افسانچہ نگار اور افسانچے کے قاری کو سمجھانے کی ضرورت نہیں۔ افسانچہ ہو، افسانہ ہو یا ناول ان میں کہانی بیان کی جاتی ہے۔ اس لیے ظاہر سی بات ہے کہ ان کے اجزائے ترکیبی جزوی فرق کے ساتھ، ملتے جلتے ہی ہوں گے۔

اصل کہانی:

ایک صاحب کہتے ہیں کہ افسانچہ وہ لوگ لکھتے ہیں جن کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں ہوتا۔ اس کے جواب میں، میں نے ان سے کہا، ایسی باتیں وہ لوگ کرتے ہیں جنھیں افسانچہ لکھنا نہیں آتا۔ کیوں کہ افسانچہ لکھنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ میں نے مزید کہا، آپ اپنی اُس طویل کہانی کو مختصراً بھی بیان کر سکتے تھے۔ لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا۔ آپ نے اس کہانی کو الفاظ کے ذخیرے میں دفن کر دیا اور قاری کو مشکل میں ڈال دیا۔ وہ دیکھو تمھارا قاری الفاظ کے انبار میں سے اصل کہانی ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا ہے، جو لفظوں کے بوجھ تلے دبی ہوئی ہے۔

نئے افسانچہ نگاروں کی عجلت و سہل پسندی:

اس پوری گفتگو میں نئے قلم کار سے میری مراد نئے افسانہ و افسانچہ نگار ہیں۔ چونکہ یہاں میرا موضوع نئے افسانچہ نگار ہیں لیکن ذرا غور کریں تو یہ تمام باتیں ایک نئے افسانہ نگار پر بھی صادق آتی ہیں۔

عام طور سے نئے قلم کاروں کو یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ ابھی صرف مطالعہ کرو۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ مطالعہ بھی کرو اور ساتھ ہی ساتھ لکھتے بھی جاؤ جس سے لکھنے کی مشق ہوتی رہے گی۔ اس بات کو اس مثال سے سمجھتے ہیں کہ اسکول، کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم کے دوران ایک طالب علم کئی تحریری امتحانات سے گزرتا ہے۔ کیا صرف مطالعہ کر لینے سے طالب علم امتحان میں اچھے نمبرات سے کامیاب ہو جائے گا؟ نہیں۔ طالب علم کو مطالعے کے ساتھ

ساتھ لکھنے کی بھی مشق کرنی ہوگی۔تب ہی وہ بہتر طریقے سے جوابات لکھ پائے گا اور اچھے نمبرات سے کامیاب ہوگا۔اس لیے نئے قلم کاروں کو مطالعے کے ساتھ ساتھ لکھنا بھی ہے تاکہ مشق ہوتی رہے اور تحریر میں نکھار آتا رہے۔ایک طالب علم نے تیرنے کے اصول اچھی طرح یاد کر لیے اور گہرے پانی میں چھلانگ لگا دی۔کیا وہ تیر پائے گا؟ نہیں۔تیرنے کے اصول یاد کرنے کے ساتھ ساتھ اس طالب علم کو تیرنے کی مشق بھی کرنی چاہیے تھی۔اسی طرح لکھنا سیکھنا ہے تو لکھنا ہوگا۔اور کوئی بھی نیا قلم کار جب پہلی دفعہ لکھے گا تو اس کی تحریر کچی پکی ہوگی پھر دھیرے دھیرے اس میں پختگی آتی جائے گی۔

کچھ ناقدین شکایت کرتے ہیں کہ نئے قلم کار سہل پسند ہوتے ہیں، شہرت کے بھوکے ہوتے ہیں، عجلت پسند ہوتے ہیں اور نہ جانے کیا کیا۔اس طرح وہ نئے قلم کاروں کی ہمت پست کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے۔مگر میری سوچ ان سے مختلف ہے۔میں ان تمام باتوں کو نئے قلم کار کی تڑپ، لگن، تجسّس اور دلچسپی کے طور پر دیکھتا ہوں۔میں مانتا ہوں کہ ان کے اندر قلم کار بننے والی چنگاریاں اور جراثیم موجود ہیں۔اسی لیے وہ اپنے آپ کو پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں جنھیں لوگ عجلت پسندی کے طور پر دیکھتے ہیں۔

میں مانتا ہوں کہ وہ غلطیاں کر کے سیکھ رہے ہیں کیوں کہ کوئی انھیں سکھانے والا نہیں۔سبھی اپنی اپنی زندگی میں مصروف ہیں۔کوئی کسی کو وقت دینے کو تیار نہیں۔ایسی صورت میں سیکھنے کا ایک ہی طریقہ رہ جاتا ہے اور وہ ہے سعی و خطا کا طریقہ۔غلطیاں کرو اور سیکھو۔جن نئے قلم کاروں کو استاد میسر ہیں اور وہ اپنے شاگردوں کو وقت بھی دیتے ہیں تو ایسے شاگرد واقعی قسمت والے ہیں۔اب رہی بات شہرت کی تو شہرت کسے نہیں چاہیے؟ جو یہ کہتا ہے کہ نئے قلمکار شہرت کے بھوکے ہیں اسے بھی چاہیے۔ہر کوئی چاہتا ہے کہ اس کا فن زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچے اور لوگ اسے پہچانیں۔وکی پیڈیا پر سعی و خطا کے طریقے کے متعلق لکھا ہے:

آموزش بہ سعی وخطا

(Learning by Trial & Error)

آموزش کے اس طریقہ کو ثابت کرنے کے لیے کئی تجربات کیے گئے اور ان کے نتائج سے یہ اخذ کیا گیا کہ کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے بار بار کوشش کرنا پڑتی ہے اور اس کوشش کے دوران کئی بار ناکامی ہوتی ہے لیکن جس دفعہ کوشش کامیاب ہوتی ہے اس کو یاد رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے اور پھر کامیاب حرکت کو دہرایا جاتا ہے اس طرح مہیج اور جوابی فعل میں ایک رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔''

نئے قلم کار سہل پسند ہیں، جلد باز ہیں اور شہرت پسند ہے۔ دراصل یہ رٹے رٹائے جملے ہیں اور یہی تنقید کی سب سے بڑی خامی ہے کہ بار بار یکساں جملے ہی دہرائے جاتے ہیں۔ کسی قلم کار کے فن پر تنقیدی مضمون لکھ ڈالو پھر بعد میں اسی مضمون میں جملوں کی ترتیب تبدیل کر کے اس مضمون کی پیشانی پر اسی صنف کے کسی دوسرے قلم کار کا نام لکھ دو اور ہو گیا دونوں قلم کاروں کے فن کا تنقیدی جائزہ۔ لیکن تخلیق میں ایسا نہیں ہوتا اسی لیے میں تخلیق کو تنقید سے مشکل مانتا ہوں۔

تسلیم کہ عجلت پسندی تو انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ پھر جیسے جیسے تجربہ ہوتا جاتا ہے ویسے ویسے یہ دور ہوتی جاتی ہے۔ میں سرکاری نوکری میں ہوں اور جانتا ہوں کہ سرکاری کام سست رفتاری سے ہوتے ہیں۔ جو نہیں جانتے وہ عجلت کرتے ہیں، ٹھوکر کھاتے ہیں، ناامید ہوتے ہیں پھر تجربات کی مدد سے جان جاتے ہیں۔

اسی طرح کوئی بھی فرد یکا یک فن کار نہیں بن جاتا۔ ابتدائی فن پاروں میں ناپختگی ہو سکتی ہے۔ مناسب رہنمائی، حوصلہ افزائی اور مسلسل مشق سے فن میں پختگی پیدا ہوتی ہے۔

ڈاکٹر ابرار رحمانی اپنے مضمون ''بچھڑے سبھی باری باری'' میں لکھتے ہیں:

''ذوقی دوٹوک بولتے تھے اور دوٹوک لکھتے بھی تھے۔ نہ زمانہ ساز تھے اور نہ زمانہ با، زاپنے کام سے کام رکھا اور آگے بڑھتے گئے۔ان کی ابتدائی تخلیقات میں ''شہر چپ ہے'' شامل ہے۔ یہ ناول برائے تبصرہ میرے مطالعہ میں آیا تو میں نے اس ناول پر سخت تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ یہ بلوغت کو پہنچ رہے کسی نو آموز کا کارنامہ ہے۔ ذوقی نے میرے اس ریمارکس کا برانہیں مانا بلکہ اعتراف کیا کہ اس ناول کو شائع نہیں کروانا چاہیے تھا، یہ جلد بازی میں اٹھایا گیا ان کا ایک غلط قدم تھا۔ چنانچہ بعد کے ان کے ناولوں میں بیان، نیلام گھر، ذبح وغیرہ ان کے پختہ فن اور طرز نگارش کا نمونہ ہیں۔''

(ماہنامہ آجکل، جولائی 2021)

دی للّن ٹاپ کے یوٹیوب چینل پر میں شمس الرحمٰن فاروقی کا ایک انٹرویو دیکھ رہا تھا جس میں ایک جگہ وہ فرماتے ہیں:

''میں نے 15 سال کی عمر میں ایک ناول لکھ مارا تھا اور ہمارے ایک دوست نے اسے چھپوا بھی دیا تھا، اب اس ناول کا نام بھی لیتا ہوں تو شرم آتی ہے۔''

عجلت پسندی سے شمس الرحمٰن فاروقی بھی بچ نہیں پائے۔ وہ آج اردو ادب میں مین اسٹریم کے نقاد، شاعر اور فکشن نگار ہیں، اور کیوں نہ ہوں؟ کیونکہ زمانہ ایک فنکار کو اس کی اچھی تخلیقات کے حوالے سے ہی یاد کرتا ہے۔ جن کا فن آج کمزور ہے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تجربات کی مدد سے ان کی تخلیقات میں پختگی آ ہی جائے گی۔ اس لیے آج جن کی

تحریریں خس و خاشاک کی شکار ہیں اگر وہ مسلسل لکھتے رہے تو یقیناً کل ان کے قلم سے اچھا ادب تخلیق ہوگا۔ اس لیے نئے افسانہ و افسانچہ نگاروں سے میں کہوں گا کہ بھرپور مطالعہ کریں اور ساتھ ہی ساتھ لکھتے بھی رہیں۔ لکھتے رہنے سے لکھنے کی خواہش زندہ رہتی ہے۔ اگر صرف مطالعہ کروگے اور لکھوگے نہیں تو ممکن ہے کہ لکھنے کی خواہش ہی مر جائے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے 15 سال کی عمر میں جو ناول لکھا تھا اسی کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے اردو ادب کو 'کئی چاند تھے سر آسماں' جیسا شاہ کار ناول دیا۔

سعادت حسن منٹو نے کتنی کہانیاں لکھیں؟ تقریباً 350۔ اور ان 350 میں سے ہم نے کتنی کہانیاں پڑھیں؟ تقریباً 20 یا 25۔ دراصل منٹو کی وہی 20،25 کہانیاں گھوم پھر کر ہمارے سامنے آئیں۔ باقی ہم نے پڑھی ہی نہیں کیوں کہ وہ کہانیاں تو ہمارے سامنے آئیں ہی نہیں۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ مطالعے کے ساتھ ساتھ لکھتے رہنا بھی ضروری ہے اور ہر بار یہ سوچ کر لکھنا ہے کہ وہ کہانی ابھی ہمارے قلم سے نکلی ہی نہیں جو ہم کو لکھنا ہے۔ جس طرح آج منٹو کی 20،25 کہانیاں ستاروں کی مانند چمک رہی ہیں۔ ٹھیک اسی طرح آپ کی اچھی تخلیقات آپ کی کمزور تخلیقات میں ہیرے کی مانند جھلملائیں گی اور قارئین انھیں ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ ایک قلم کار اپنی اچھی تخلیقات کے حوالے سے ہی یاد کیا جاتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ایک قلم کار کے قلم سے نکلنے والی ہر تخلیق شاہکار ہو۔ شاہکار تو چند ہی ہوتی ہیں یا پھر ایک دو، جن کے حوالے سے وہ تخلیق کار یاد کیا جاتا ہے۔

نئے افسانچہ نگاروں کی پرورش:

سینیر افسانچہ نگاروں اور ناقدین پر یہ ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ وہ نئے افسانچہ نگاروں کی پرورش کریں۔ جس طرح اچھے ماں باپ اپنے بچوں کی پرورش کرتے ہیں، جس طرح ایک اچھا استاد اپنے شاگردوں کی پرورش کرتا ہے، بس اسی طرح۔ غلطی پر نئے قلم کار کو ڈانٹ پلانا، برا بھلا کہنا، اسے ذلیل و خوار کرنا غلط بات ہے۔ اس طرح تو اصلاح نہیں ہو

سکے گی۔ البتہ قلم کار کا حوصلہ پست ہو جائے گا۔

کوئی اپنی مرضی سے کسی کو قلم کار بنا نہیں سکتا لیکن جو اس میدان میں طبع آزمائی کر رہے ہیں اور کسی لحاظ سے ان کا فن کمزوریوں کا شکار ہے تو اس کی اصلاح کی جاسکتی ہے۔ ایک اچھے استاد کی طرح اور اچھے سرپرست کی طرح۔ اگر کوئی سینیئر افسانچہ نگار یا نقاد کسی نئے افسانچہ نگار کے کسی کمزور افسانچے کو لے کر اسے ذلیل کرتا ہے اور اس کے متعلق ایسے جملے کہتا ہے کہ کتابڈی چھوڑ دے، تو سمجھ لیجئے کہ وہ اس صنف کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ ویسے بھی اس صنف کے دشمن کم نہیں ہیں۔

سوشل میڈیا کے مختلف گروپس پر اردو کو فروغ دینے کے لیے ایک میسج وائرل ہو رہا تھا۔ وہ میسج کچھ اس طرح ہے:

> ''سوشل میڈیا پر اردو رسم الخط کو فروغ و ترجیح دیجیے کیوں کہ اب یہ زبان واحد ذریعہ ہے ملت کو جوڑنے کا۔ اس کے رسم الخط کی حفاظت بھی ہماری ہی ذمہ داری ہے۔ لکھنے میں املا یا تذکیر و تانیث کی غلطی کی فکر نہ کریں بس لکھتے رہیں۔ اس عمل سے یہ فائدہ ہوگا کہ گوگل الفاظ کی شناخت کر لے گا اور آہستہ آہستہ آٹو کریکشن کے وہ وسائل حاصل ہو جائیں گے جو انگریزی اور دوسری زبانوں کو حاصل ہیں۔ اپنی اردو دوستی کا ثبوت دیجیے اور جو کچھ لکھنا چاہتے ہیں وہ صرف اردو میں لکھئے۔ یہ عمل بھی اردو کی ایک خدمت میں شمار کیا جائے گا۔ اپنی مادری زبان اردو سے محبت ہے تو اردو میں بھی ٹائپ کریں اور دوسرے کو بھی آمادہ کریں۔ نئے ٹائپ کرنے والوں کی غلطی ان کے ان باکس میں بتائیں، سرعام ان کا مذاق اڑانا مناسب نہیں۔ ان کی حوصلہ

افزائی کی جائے۔ شکریہ!“

(سوشل میڈیا سے ماخوذ)

بس کچھ اسی ڈھنگ سے اہل قلم حضرات کو نئے افسانہ و افسانچہ نگاروں کی پرورش کرنی ہوگی۔ اور یہ عمل اردو اور اردو ادب کے فروغ میں معاون ثابت ہوگا۔

بے جا تنقید:

چونکہ دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ آج کل زیادہ تر نقاد نئے افسانچہ نگاروں کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہوئے ہیں۔ اس لیے نئے افسانچہ نگاروں کو چاہیے کہ تنقید کو قبول کریں۔ اگر کوئی آپ کی تخلیق پر تنقید کرتا ہے تو ضروری نہیں کہ اس تنقید نگار کی ہر بات آپ قبول کر ہی لیں۔ پہلے ان باتوں پر غور و فکر کریں پھر اس کے بعد یہ آپ کا حق ہے کہ آپ اس میں سے کن باتوں کو قبول کریں اور کن کو رد کریں۔ جب تخلیق ہوئی ہے تو تنقید بھی ہوگی۔ تخلیق اور تنقید کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ کچھ تنقید نگار واقعی غیر جانب داری سے کام لیتے ہوئے فن کار کے فن پر اچھا تجزیہ کرتے ہیں۔ اس کی خوبیوں اور خامیوں سے آگاہ کرتے ہیں۔ ایسے ناقدین کی ہر تخلیق کار کو ضرورت ہے۔ لیکن کچھ تنقید نگار ایسے ہوتے ہیں جو تخلیق کار کو صرف ذلیل کرنا چاہتے ہیں۔ اس طرح کا فعل وہ حسد، دشمنی، گروپ بندی یا کسی رنجش کے سبب کرتے ہیں۔ تخلیق کار کو ایسے جعلی تنقید نگاروں کو پہچاننا ہوگا۔ اگر کوئی بے جا تنقید کرتا ہے اور آپ کے پاس اس کی بات کو غلط ثابت کرنے کا جواز موجود ہے تو تخلیق کار اپنا موقف ضرور پیش کرے لیکن فوراً نہیں، کچھ وقفے کے بعد۔ پہلے تھوڑا صبر کرے پھر کچھ دنوں میں اطمینان سے اپنا موقف تیار کر کے پیش کر دے۔

ایسے جعلی ناقدین سے بار بار الجھنے سے آپ کا تخلیقی کام متاثر ہوگا اور آپ دل برداشتہ ہو کر اپنے تخلیقی کام کو ترک کر کے خاموش بیٹھ جائیں گے اور وہ جعلی ناقدین اپنے منفی مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اس لیے انھیں نظر انداز کریں۔

ذرا نم ہو تو.....:

آج کل اس شکایت میں بڑی شدت نظر آ رہی ہے کہ نئے قلم کار کمزور افسانچے لکھ رہے ہیں اور افسانچے کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا یہ صرف افسانچے کے ساتھ ہی ایسا ہو رہا ہے؟ کیا آج جتنی بھی تخلیقات منظرِ عام پر آ رہی ہیں، خواہ وہ افسانہ ہو، ناول ہو یا پھر غزل، کیا وہ سب شاہکار ہیں۔ نئی نسل کو ان کی سطح پر پرکھنے کی ضرورت ہے، اپنی سطح پر نہیں۔ فن کوئی بھی ہو وہ آتے آتے ہی آتا ہے۔ تو پھر افسانچہ اور افسانچہ نگاروں کے ساتھ اس طرح کا برتاؤ کیوں؟ نئی نسل کے افسانچہ نگاروں کو رہنمائی اور ہمت افزائی کی ضرورت ہے۔

کچھ ناقدین کا نئے قلم کاروں کے ساتھ رویہ بہت سخت ہے۔ یہ قلم کار، جب کل پختہ ہو جائیں گے تب یہ ان ناقدین کو کس نام سے یاد کریں گے۔ بچہ پیدا ہوتے ہی دوڑنا سیکھ نہیں جاتا۔ وہ پہلے رینگتا ہے پھر گھٹنوں کے بل چلتا ہے۔ اس کے بعد کسی چیز کا سہارا لے کر چلتا ہے۔ پھر بغیر کسی سہارے کے چلنا سیکھ لیتا ہے پھر دھیرے دھیرے دوڑنے بھی لگتا ہے۔ فرض کیجیے کہ میں دوڑ رہا ہوں اور رینگنے والوں پر یا کسی چیز کا سہارا لے کر چلنے والوں پر ہنس رہا ہوں تو یہ کوئی عقلمندی والی بات نہیں ہوئی۔ نئی نسل کی بہتر پرورش کے لیے ان کی ہمت افزائی ضروری ہے، نہ کہ ان کے حوصلے کو طنز کے تیر برسا کر کرچی کرچی کر دیا جائے۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

افسانچے کی مقبولیت کا راز:

آج زندگی تیز رفتار ہو گئی ہے۔ فرصت کے وہ لمحات جو پہلے میسر تھے اب نہیں ہیں۔ تب سوال یہ ہے کہ فرصت کے وہ لمحات کہاں چلے گئے؟ دراصل بات یہ ہے کہ فرصت کے لمحات پہلے بھی میسر تھے اور اب بھی ہیں۔ لیکن اب ہمارے سامنے تفریح کے جدید ذرائع موجود ہیں اور ان ذرائع نے ہر کسی کو متاثر کیا ہے۔ ہر کوئی ان کی جانب کھنچا چلا جا رہا ہے۔ قصہ یہ ہے کہ تفریح کے

مختلف ذرائع پہلے بھی تھے،لیکن وہ اتنے پر کشش نہیں تھے جتنے آج کے جدید ذرائع ہیں۔

کتاب مختلف قسم کی ہوتی ہے۔ چونکہ میں یہاں افسانچے کے حوالے سے بات کر رہا ہوں اس لیے میں خصوصاً کہانی کی کتابوں کا ہی ذکر کروں گا۔ آج سنیما، ٹی وی، موبائل اور انٹرنیٹ پر کئی کہانیاں بکھری پڑی ہیں جو آڈیو ویڈیو کی صورت میں موجود ہیں۔ اس لیے کہانیوں کے شوقین لوگ اب کتابوں سے کہانیاں پڑھنے کے بجائے ، آڈیو کی شکل میں انھیں سن رہے ہیں اور ویڈیو کی صورت میں دیکھ رہے ہیں۔

انسان جب کوئی تحریر پڑھتا ہے تو دماغ میں اس کی تصویر بناتا جاتا ہے لیکن ویڈیو دیکھتے وقت دماغ کو امیج بنانے کی ضرورت نہیں ہوتی اس لیے ذہن میں تھکاوٹ بھی پیدا نہیں ہوتی اور تازگی برقرار رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تین گھنٹے فلم دیکھنے کے بعد بھی لوگ تھیٹر سے تھکے ماندے نہیں نکلتے بلکہ ہنستے کھلکھلاتے نکلتے ہیں ۔ جب کہ مسلسل تین گھنٹے پڑھنے سے ذہنی تھکاوٹ کا ہونا لازمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب لوگ کہانی پڑھنے کے بجائے کہانی دیکھ رہے ہیں۔ ٹی وی، موبائل اور انٹرنیٹ کی مدد سے بے شمار کہانیاں ایک کلک کے ساتھ مل جاتی ہیں۔

جدید ٹیکنالوجی کی جیسے جیسے ترقی ہوئی اسی طرح کہانیوں کی ضخامت کم ہوتی گئی۔ ریڈیو، سنیما، ٹی وی، موبائل، انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا نے کہانی کی ضخامت کو داستان سے لے کر ناول، ناولٹ، طویل افسانہ، مختصر افسانہ اور اب افسانچہ تک لا دیا ہے۔ بس یہی وہ وجہ ہے کہ اب قاری طویل کہانیوں کا مزہ مختصر کہانیوں میں لینا چاہتا ہے۔ یہی افسانچے کی مقبولیت کا راز ہے۔

محمد علیم اسماعیل

جنوری 2020

افسانچہ

جوگندر پال

میرے ساتھ کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ رنگ برنگے پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ اڑتے اڑتے کہیں سے آ نکلتے ہیں اور تھوڑی دیر میرے ذہن کی شاخوں پر بیٹھ کر جھولنے لگتے ہیں اور پھر ایک دم کھلنڈری سی فکرمندی سے میرے افسانچوں میں اتر آتے ہیں اور انھیں لکھ کر میں گویا پھر انھیں آکاش کی طرف پرواز بھرنے کو چھوڑ دیتا ہوں۔

کوئی کہانی اتنی طویل بھی ہوسکتی ہے کہ پورا ناول بن جائے تاہم زندگی کی بیکرانی جب اپنی چھوٹی چھوٹی کہانیوں میں بٹی ہوئی معلوم ہوتو اس کیفیت کے سراغ کے لیے فن کار کو شاید نظریں دوڑانے کی بجائے گاڑنا پڑ جاتی ہیں اور یوں وسعتیں جو بذات خود ویران ہوتی ہیں ننھے منے پیانوں میں بٹ کر بستیوں کا سماں باندھتی ہوئی محسوس ہونے لگتی ہیں۔

تحریر کے ذی جان ہونے کا انحصار، دراصل اس امر پر ہوتا ہے کہ اس کے وجود سے ہی اس کی ذات کا ادراک ہو جائے۔ ہمارا وجود، بڑا یا چھوٹا، اسی لیے ہمیں بوجھ معلوم نہیں ہوکہ اس کے سارے اجزا داخلی اور مقامی ہونے کے باعث عین متناسب ہوتے ہیں۔ کہانی اگر اپنے اصل تناسب سے باہر نہ ہوتو ایک سطری ہوکر بھی پوری ہوتی ہے ورنہ اپنی تمام تر طوالت کے باوصف ادھوری کی ادھوری۔

ادب میں گویائی کا مفہوم محض نطق کی صلاحیت کو ثابت کرنے سے ادا نہیں ہو جاتا۔ اب تو کچھ کہہ پانے کی تخلیقی کاوش سے معرض وجود میں آتا ہے۔ اس اعتبار سے عین ممکن ہے کہ کوئی نہایت مختصر اور متناسب کہانی اتنی پرگو ہو کہ اپنے نقطۂ آغاز سے بھی بہت پہلے سے

شروع ہوتی ہوئی لگے اور قاری اسے اپنے تلازموں کی روشنی میں اس کے خاتمے کے بعد بھی پڑھتا چلا جائے اور اس طرح اس کے ذہن میں نامعلوم یہ کہاں پہنچ کر ختم ہو۔ افسانچے کے قاری کو لکھنے والے کی رہبری میں کسی متعین مقام پر نہیں پہنچنا ہوتا۔ اس صنف کی اہمیت اس میں ہے کہ پڑھنے والوں کی تخلیقی شرکتوں کا اسباب ہو اور معانی کی نشاندہی کی کوشش میں انھیں حسب واردات مقام یا کوچ کے آزادتر مواقع میسر آئیں۔ میرا خیال ہے کہ مستقبل کے ادب میں قاری کی اس طرح کی شرکتوں کی گنجائش میں برابر اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔

پتہ نہیں کسی نے سچ مچ کبھی ہتھیلی پر پہاڑ اٹھایا تھا یا نہیں، مگر تخلیق کار کو اس کے بغیر چارہ نہیں کہ اپنی ہتھیلی پر دو جہاں کی کشادگی پیدا کر لینے پر حاوی ہو۔ کسی مصر اور فوری واردات میں لغوی افراط کو بروئے کار لانے سے گھٹن کا ماحول تیار ہونے لگتا ہے۔ وضاحتوں کی ایک الگ اہمیت ہوتی ہے جس سے انکار ممکن نہیں، تاہم فنون لطیفہ کے ذیل میں ہدایت و وضاحت کے عمل سے ایک ایسے جبر کی صورت کھڑی ہو جاتی ہے جس سے واردات کے کھلے امکانات کا سد باب ہو۔ فن کاروں کا یہ اصرار بڑا معنی خیز ہے کہ بولو مت، دکھاؤ، اور اسی فنی تقاضے سے عہدہ برآ ہونے کے لیے انکسار اور اختصار، افسانچے کے فطری معاونین ہیں۔ (بے اصطلاح، سنہ 1998، جوگندر پال، صفحہ نمبر 83 اور 84)

❖❖❖

افسانچہ کیا ہے؟

ڈاکٹر ایم اے حق

افسانچے کو سمجھنے سے پہلے ہمیں لازمی طور پر افسانے کو سمجھنا ہوگا۔ کیوں کہ جس قلمکار نے دانستہ وغیر دانستہ طور پر اس صنف کی ایجاد کی تھی وہ صحیح معنوں میں ایک افسانہ نگار تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اُنھوں نے ریڈیو ڈرامے، ذاتی خاکے، فلم اسکرپٹ رائٹنگ، مضامین وغیرہ پر بھی طبع آزمائی کی تھی۔ لیکن کامیابی اور شہرت اُنھیں افسانہ اور افسانچہ نگاری میں ہی ملی ہے۔

جی ہاں! آپ ٹھیک سمجھے۔ میں سعادت حسن منٹو کی ہی بات کرر ہا ہوں۔ لگے ہاتھوں میں یہ بات بھی ظاہر کردوں کہ اُنھوں نے کسی منصوبہ بندی کے تحت افسانچہ نگاری (حالانکہ لفظ 'افسانچہ' عظیم افسانچہ نگار جوگندر پال کی دین ہے) کی بنیاد نہیں ڈالی تھی۔ تو پھر سوال یہ اُٹھتا ہے کہ آخر افسانچہ کیوں کر صفحۂ قرطاس کی زینت بنا۔ اس لیے میں یہاں اُن واقعات اور حالات کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں جس سے متاثر ہو کر اُنھوں نے مختصر ترین ادبی پاروں کی تخلیق کی تھی۔ اس حقیقت سے شاید ہی کوئی اُردو ادیب یا اس کا طالب علم ناواقف ہوگا کہ منٹو کی زندگی مالی مشکلات سے بھری پڑی تھی۔ اُن کا بچپن نہایت تنگ دستی میں بیتا تھا۔ والد صاحب مقامی کورٹ کے جج کے عہدے پر فائز تھے۔ پہلی بیوی سے کثیر الاولاد ہونے کے باوجود دوسری شادی کی تھی۔ جن سے منٹو پیدا ہوئے تھے۔ اتنا ہی نہیں وہ نہایت ایماندار بھی تھے اور نہ جانے کیوں ۱۹۲۰ میں وہ اپنے عہدے سے سبکدوش بھی ہو گئے تھے۔ یعنی کریلے پر نیم چڑھا۔ یوں بھی جوانی میں جیب خرچ کی سخت ضرورت پڑتی ہے وہ ۱۹۳۳

میں عبد الباری علیگ کے رابطے میں آئے۔ وہ منٹو کی انگریزی صلاحیت سے واقف تھے۔اُن کی صلاح پر منٹو نے دنیا کے مشہور مصنفوں کی انگریزی کتابوں کا اُردو میں ترجمہ کرنا شروع کر دیا جس کا معاوضہ بھی انھیں ملنے لگا۔ منٹو کے ترجمے کافی پسند کئے جانے لگے۔ تب اُنھوں نے سوچا کہ وہ خود اردو میں اپنی تخلیق کیوں نا شائع کرائیں۔ مختصر یہ کہ وہ اپنی قسمت آزمانے کے لیے ۱۹۳۶ میں بمبئی چلے گئے۔ وہاں ویکلی فلمی میگزین ''مصور'' میں اڈیٹر کا عہدہ سنبھالا۔ بمبئی ہی میں ۱۹۳۹ میں صفیہ سے شادی کی، پھر بچے ہوئے۔ گھر کے اخراجات میں اضافہ ہوا۔ زیادہ پیسے کے لالچ میں وہ ۱۹۴۰ سے ۱۹۴۲ تک آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس میں کام کیا۔ باس کے حاکمانہ رویے سے تنگ آ کر نوکری چھوڑ دی اور واپس بمبئی لوٹ آے۔ اب قسمت منٹو پر مہربان ہوگئی۔ اُن کی فلم اسکرپٹ رائٹنگ نے کامیابی کے جھنڈے گاڑنے شروع کر دیے۔ خوب روپے کمائے۔ کار خریدی۔ شراب نوشی عروج پر پہنچی۔ غرض کہ ابتدائی زندگی جتنی مفلسی میں کٹی تھی اُس کے برعکس زندگی اب پر مسرت ڈھنگ سے گزرنے لگی تھی۔ بمبئی کے معروف لوگوں سے دوستی گانٹھ لی۔ جن میں نور جہاں، نوشاد، عصمت چغتائی، شیام اور اشوک کمار وغیرہ اہم تھے۔

پھر ملک کی تقسیم کا ہنگامہ شروع ہوگیا۔ فرقہ وارانہ ذہنیت پروان چڑھنے لگی۔ جگہ جگہ فسادات ہونے لگے، لوٹ مار کا بازار گرم ہوگیا، ایک دوسرے فرقے کی عورتوں اور لڑکیوں کی عزّتیں نیلام ہونے لگیں۔ منٹو نے احتیاطاً اپنی بیوی بال بچوں کو لاہور پہنچا دیا تھا، پھر بھی وہ بمبئی چھوڑ کر پاکستان نہیں جانا چاہتے تھے۔ انھیں بمبئی سے محبت ہوگئی تھی۔ جس کا اظہار اُنھوں نے بمبئی کو خیر باد کرنے کے ساڑھے چار سال بعد لاہور میں لکھے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے۔ اس مضمون کا ذکر ممبئی کے ایک صحافی جئے راج سنگھ نی اپنے مضمون

MUMBAI MIRRORED: THE CITY MANTO LOVED AND LOST میں کیا ہے۔ جو Mumbai Mirror کے ۲۶ ستمبر ۲۰۱۹ کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ موصوف نے منٹو کے ممبئی چھوڑنے کے درد کو اُن کے ہی

الفاظ میں پیش کیا ہے۔

I stayed in Bombaiy for 12 years.And what I am I am because of those years .Today I find myself living in pakistan. It is possible that tomorrow I may go to live elsewhere.But whereever I go , I will be what Bombay made me.Wherever I live I will carry Bombay with me .When I left Bombay I was sad at leaving it.That was where I I had formed the most lasting friendship of my life,friendship of which I am proud. That was where I had got married,where my first child was born,.There were times in Bombay where I did not have enough to eat and there were times when I was making vast sums of money and living it up.That was the city I loved . That is the city I still love .

میرا ان باتوں کو بتانا اس لیے ضروری ہے کہ آپ یہ تصور کر سکیں کہ منٹو کو ممبئ یعنی ہندستان چھوڑتے وقت کتنی جھنجھلاہٹ، بے چینی، ذہنی اذیّت کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ حالات سے مجبور ہو کر جب منٹو جنوری ۱۹۴۸ میں لاہور پہنچے تو وہاں کا نظارہ ہی بدل چکا تھا۔ پاکستان میں اسلامی جذبہ جوش مار رہا تھا۔ فلم انڈسٹری میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ غرض کہ منٹو کو پھر بھر پیٹ کھانے کے لالے پڑ گئے۔ لے دے کے اخبار اور رسائل ہی تھے جن کی خفیف آمدنی سے شب و روز کا گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ منٹو اپنی خستہ حالی کا ذمہ دار ملک کی تقسیم اور اس کے نتیجے میں بھڑکنے والے فسادات کو مانتے تھے۔ منٹو کی اسی جھنجھلاہٹ، غصہ، بے

چینی، گھبراہٹ، صدمے اور تحت الشعور میں رینگتے خوف کی وجہ سے مختصر اور مختصر ترین تحریریں یعنی افسانچے عالم وجود میں آئے ہیں۔۱۳۲ افسانچوں پر مشتمل ''سیاہ حاشیے'' اکتوبر ۱۹۴۸ کو شائع ہوا تھا۔

میں یہ بات اس لیے وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ اُن کے لگ بھگ سارے افسانچے ہندو مسلم فساد، لوٹ مار، ہنگامے، آگ زنی، طنز، نفرت سے لبریز ہیں۔ اُنھوں نے خواب و خیال میں بھی نہیں سوچا ہوگا کہ شدّت جذبات سے مغلوب ہو کر تحریر کیے گئے اُن کے مختصر مختصر افسانے مستقبل میں کبھی افسانچے نام کی صنف سے پکارے جائیں گے۔ جو رفتہ رفتہ ترقی کی منزلیں طئے کرتا ہوا اکیسویں صدی کی پہلی دو دہائیوں میں ایک مقبول صنف کی شکل اختیار کر لے گی۔ مجھے اس بات کا بے حد افسوس ہے کہ اتنی مقبولیت کے باوجود ہمارے معیاری تنقید نگاروں نے ابھی تک اس صنف کو قابل تنقید نہیں سمجھا ہے۔ ہاں! یہ بات صحیح ہے کہ دور حاضر میں منی کہانیوں، افسانچوں، منی افسانوں، مختصر مختصر کہانیوں، کہانچیوں کی جیسے ایک جھڑی سی لگ گئی ہے۔ نئے پُرانے لکھاری حضرات اس صنف پر دھڑلے سے طبع آزمائی کر رہے ہیں۔ اب تک سینکڑوں مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ یہ اس صنف کی مقبولیت کو ظاہر کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بیشتر رسائل و اخبارات مختصر تحریروں کو بڑے اہتمام سے شائع کرتے ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ کچھ قلمکاروں نے اسے تخلیق کا ایک سہل طریقہ سمجھ لیا ہے اور راتوں رات مقبول ہونے کے چکر میں لطیفہ گوئی، ہم کلامی (مونو لاگ)، ڈائیلاگ، (صرف سوال جواب)، حکایتوں، محاوروں کا بھی بے دھڑک استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ چونکہ صحیح معنوں میں افسانچہ نگاری یا منی کہانی کی بُنت ایک مشکل ترین صنف ہے۔ اس میں وہی لکھاری کامیاب ہو سکتے ہیں جن کو کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ باتوں کو سمیٹنے کا شعور حاصل ہو۔ عنوان کی موزونیت کو پرکھنے کا سلیقہ معلوم ہو، غیر متوقع اختتام کے ذریعہ قارئین کو چونکا دینے کے ہنر سے واقفیت ہو۔ بہت کم ہی قلمکار ایسے ہیں جن میں مندرجہ بالا خصوصیتیں ایک ساتھ یکجا ہوتے

ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی ناکامیوں کا زہر اس صنف کی تنقیص کی شکل میں اُگلتے ہیں اور اُن متعصب حضرات کو مواد فراہم کرتے ہیں۔ اس صنف کے رموز و اوقاف سے بے بہرہ ہمارے یہ ناقص افسانچہ نگار یا منی کہانی کار!!! حالانکہ اُنھیں (متعصب ناقدوں کو) یہ سوفی صد حق ہے کہ وہ ویسے افسانچہ نگاروں کی افسانچہ نگاری پر انگشت نمائی کریں۔ لیکن وہ ایسا نہیں کریں گے۔ وہ اپنی بھڑاس نکالیں گے اس صنف کو ہی تنقید کا نشانہ بنا کر! بہت سی واہیات غزلیں و نظمیں، ناقص افسانے، آئے دن مختلف رسائل و جرائد میں چھپتے رہتے ہیں کیا آج تک کسی ناقد کی یہ ہمت ہوئی ہے کہ وہ صنف غزل و نظم گوئی، یا افسانہ نگاری کے وجود سے ہی منکر ہو جائے۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ کچھ ناسمجھ اور ناعاقبت اندیش اور اسلام سے خار کھائے فرقہ پرست لوگ مسلم لڑکے، کے کسی کے بہکاوے میں آکر دہشت گردی میں ملوث ہو جانے پر اسلام ہی کو دہشت کا پروردہ مذہب قرار دینے سے باز نہیں آتے ہیں۔ ہاں! اتنا ضرور ہوا ہے کہ جو ایک بڑی کھائی افسانچوں اور تنقید نگاروں کے درمیان حائل تھی وہ اب رفتہ رفتہ سمٹتی جا رہی ہے۔

ہاں! تو میں کہہ رہا تھا کہ افسانچہ، افسانہ نگار کے ذہن میں پنہاں افسانے کے رموز و اوقاف کے لبادے کو اوڑھ کر عالم وجود میں آیا ہے۔ ایسے خیالات کا اظہار ہمارے کئی دوستوں نے کیا بھی ہے کہ ایک کامیاب افسانہ نگار ہی ایک اچھا افسانچہ نگار بن سکتا ہے۔ میں اس منطق سے مکمل طور پر اتفاق نہیں کرتا ہوں۔ لیکن انکار بھی ممکن نہیں۔ مثلاً محمد بشیر مالیر کوٹلوی، نورشاہ، دیپک بدکی، سرور غزالی (جرمنی)، پروفیسر اسلم جمشید پوری، پرویز بلگرامی (کراچی)، امجد مرزا امجد (لندن)، اشتیاق سعید، ویریندر پٹواری، پروفیسر رؤف خوشتر، راجہ یوسف، سید نور الحسنین، مشتاق احمد نوری، ایم۔ مبین، ابرار مجیب، احمد کلیم فیض پوری، شازیہ ستار نایاب (لاہور)، جاوید نہال حشمی وغیرہ نے کامیاب افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین افسانچے بھی لکھے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ سیّد نور الحسنین، ابرار مجیب، اشتیاق سعید، مشتاق احمد نوری وغیرہ کے افسانچوں کی تعداد بہت کم ہے۔ لیکن جتنے بھی ہیں

ان میں معیاری افسانچوں کا تناسب قابلِ تعریف ہے۔دوسری طرف میں بہت سے ایسے افسانچہ نگاروں کو جانتا ہوں جنہوں نے اس صنف میں اچھا خاصا نام کمایا ہے جبکہ افسانہ نگاری میں وہ اتنے کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔مثلاً مظفر حنفی، پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، ایم۔اے۔حق، ڈاکٹر عظیم راہی، رونق جمال، وکیل نجیب، ڈاکٹر نخشب مسعود وغیرہ۔

مندرجہ بالا باتوں سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ایک اچھا افسانہ نگار ہی ایک کامیاب افسانچہ نگار نہیں بن سکتا ہے۔

کچھ ایسے بھی افسانہ نگار ہیں جن کی عظمت اور شہرت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔اُن کے افسانے ملک و بیرون ملک میں بڑے ذوق وشوق سے پڑھے جاتے ہیں لیکن اُن کے افسانچوں نے ویسی کامیابی حاصل نہیں کی۔جیسے سلام بن رزاق، خورشید حیات وغیرہ۔

مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں ہم بلا جھجک یہ کہہ سکتے ہیں کہ افسانچے کی کامیابی کا انحصار اس کی تکنیک کی جانکاری پر ہے۔اگر کوئی معیاری افسانہ نگار اس تکنیک سے واقف ہے تو بلا شبہ وہ ایک اچھا افسانچہ نگار بن سکتا ہے۔لیکن اگر کوئی اوسط درجے کا افسانہ نگار بھی افسانچے کے رموز واوقاف سے بھلی بھانتی واقف ہے تو اُن کو ایک بہترین افسانچہ نگار بننے سے کون روک سکتا ہے؟

جہاں تک افسانچے کی طوالت کا تعلق ہے، مجھے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ آخر لوگ افسانچے کی ہی کتر بیونت کے لیے کیوں تُلے ہوئے ہیں۔اُردو ادب میں اور بھی نثری اصناف ہیں لیکن میں نے تو کبھی کسی کو داستان کی لمبائی کو محدود کرتے، ناول کی طوالت کو قید کرتے، افسانے کے صفحات طے کرتے، انشائیے پر قدغن لگاتے، مضامین کی سائز پر فیصلہ صادر کرتے نہیں دیکھا ہے۔تو پھر یہ افسانچے پر ہی ہائے توبہ چہ معنی دارد؟

جہاں تک منٹو کا سوال ہے تو اُنھوں نے کبھی یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ ایک نئی صنف کی ایجاد کرنے جا رہے ہیں۔اُن کے ''سیاہ حاشیے'' کے ۳۲ افسانچوں پر جب ہم طائرانہ نگاہ ڈالتے ہیں تو پاتے ہیں کہ اس میں الہنا ڈیڑھ لائن، قسمت ۲ لائین، آرام کی ضرورت ۲

لائین، رعایت ۲ لائین، سوری ڈھائی لائین، صدقے اس کے ڈھائی لائین، خبردار ۳ لائین، دعوتِ عمل ۳ لائین، آنکھوں پر چربی ساڑھے ۳ لائین سے لے کر اشتراکیت ۷ لائین، پیش بندی ٦ لائین، نگرانی میں ۸ لائین، ہوتے ہوئے تقسیم ۲۴ لائین، مزدوری ۵٦ لائین اور تعاون ۵۸ لائین کی کہانیاں موجود ہیں۔ یعنی اُن کی نگاہ میں ایسی تحریروں کے لیے کسی قسم کے ضابطے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی۔ چونکہ یہ مختصر کہانیاں اُن کے غم و غصّے کا اظہار یہ تھے اس لیے اُن کے دل و دماغ اور ذہن میں جن خیالات کا یلغار ہوتا رہا وہ صفحۂ قرطاس پر نمودار ہوتے گئے۔ اُس وقت تک منٹو کافی افسانے لکھ چکے تھے۔ اس لیے ہم یہ تو بلا جھجک کہہ سکتے ہیں کہ اُن افسانوں کی بہ نسبت یہ تحریریں چھوٹی ضرور تھیں۔ تو یہ بات کھل کر سامنے آ گئی کہ افسانچہ چھوٹا ہونا چاہیے۔ سیاہ حاشیے کی کچھ کہانیوں کو چھوڑ کر جیسے تقسیم، مزدوری، تعاون وغیرہ۔ اب سوال اُٹھتا ہے کہ یہ کتنا چھوٹا ہونا چاہیے۔ میرے خیال میں افسانچے میں مختصر کرتے رہنے کے عمل کو تب تک جاری رکھنا چاہیے جب تک اس سے ابہام کی بو نہ آنی شروع ہو جائے۔ اس اصول کو ذہن نشیں کر لیں کہ تفصیل کے زائد ایک جملے پر بھی طوالت کا الزام لگ سکتا ہے۔ بس یہی افسانچے کی لمبائی کا Yardstick ہو سکتا ہے۔ یعنی اتنا طویل نہ کریں کہ بے جا طوالت کا طوق لٹک جائے اور نہ اتنا مختصر کریں کہ ابہام کا خطرہ منڈلانے لگے۔ افسانچہ جتنا مختصر ہوگا اتنا کامیاب ہوگا۔

''افسانچہ'' دراصل افسانے کی بونسائی (Bonsai) شکل ہے۔ یہ ایک جاپانی ہنر ہے جس میں بڑے بڑے پیڑوں کو انتہائی چھوٹی شکل میں تبدیل کیا جاتا ہے۔ یہ ایک منفرد تکنیک ہے جس میں فنی مہارت، ذہانت، لگن، مشقت اور جانفشانی کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی قیمتیں آسمان کو چھوتی ہیں اور یہ بڑے رئیسوں، امیروں، نوابوں، دولت مندوں کے ڈرائینگ روم کی زینت بنتے ہیں۔ آپ لوگوں نے ایسی جگہوں پر برگد، پیپل، آم، اِملی کی چھوٹی شکلیں ضرور دیکھی ہوگی۔ جس کے تمام اجزاء پیڑوں جیسے ہی ہوتے ہیں، لیکن اُن کی جسامت اُن پیڑوں کی بہ نسبت بہت چھوٹی ہوتی

ہے۔جس طرح ''بونسائی'' کا بنانا بہت آسان کام نہیں ہے، ٹھیک اُسی طرح ہر قلمکار کے لیے ''افسانچے'' تحریر کرنا ممکن نہیں۔اس میں بھی افسانے کے تمام لوازمات موجود رہنے کے باوجود یہ بہت مختصر سی تصنیف نظر آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے لیے فنی مہارت، ذہانت، محنت، لگن، افسانچے کی تکنیک سے واقفیت، الفاظ پر پورا کنٹرول ہونا لازمی ہے۔اس لیے افسانے کے اجزائے ترکیبی جیسے پلاٹ، کردار، مکالمے، کلائمکس، پیغام وغیرہ کو نہایت فنی چابکدستی سے افسانچے کی شکل میں ترتیب دی جاتی ہے۔

یہ بات اب واضح ہوگئی ہے کہ افسانچے کے لیے اختصار کی کیا اہمیت ہے۔لیکن اس اختصار کو سطور اور صفحات میں قید کرنا مناسب نہیں۔میرے خیال میں کہانی پن کے لبادے میں پیغام کی مکمل ترسیل جس میں تکرار، غیر ضروری مکالمے اور تفصیلات کی عدم موجودگی کے ساتھ ساتھ اختصار کو برتنے والے Appropriate الفاظ کی ادائیگی کا سلیقہ بھی ہو۔یہ افسانچے کی ساخت کے لیے ضروری ہے۔

کسی لفظ یا جملے کا بار بار استعمال تکرار کہلاتا ہے۔ایک نمونہ یہاں پیش خدمت ہے:

بڑی بھابی کا موڈ آج کچھ اُکھڑا ہوا تھا۔بڑے بھیّا حسب معمول خاموش تھے۔وہ کرتے بھی کیا۔بڑی بھابی تھیں ہی بد دماغ۔جس دن سے بڑی بھابی شادی کر کے اس گھر میں آئی ہیں گھر کا ماحول ہی بدل گیا ہے۔میں نے جب دیکھا کہ بڑی بھابی کا موڈ اُکھڑا ہوا ہے تو چپ چاپ گھر سے باہر نکل گیا۔

اس نمونے میں تکرار کی بھرمار ہے۔ایک کامیاب افسانچہ نگار اسے یوں لکھے گا۔

''بڑی بھابی کا موڈ آج کچھ اُکھڑا ہوا تھا۔(بڑے) بھیّا خاموش تھے۔وہ کیا کرتے (بڑی بھابی) وہ تھیں ہی بد دماغ۔جس دن سے (بڑی بھابی) وہ شادی کر کے اس گھر میں آئی ہیں۔گھر کا ماحول ہی بدل گیا ہے۔میں نے جب دیکھا کہ (بڑی بھابی کا موڈ اُکھڑا ہوا ہے) اُن کا مزاج بگڑا ہوا ہے۔تو چپ چاپ گھر سے باہر نکل گیا۔

غیر ضروری مکالمے کی مثال دیکھیے:

کال بیل کی گھنٹی بجی ۔ایک بزرگ شخص نے سخت ناگواری کی حالت میں دروازہ کھولا۔سامنے اپنے بیٹے شاہد پر نظر پڑتے ہی وہ غصہ سے اُبل پڑے ''کہاں گئے تھے اتنی رات کو؟ جانتے ہو ابھی کتنا بجا ہے؟''

شاہد خاموش کھڑا رہا۔

''اب بولتے کیوں نہیں ؟ ساتھیوں کے ساتھ فلم دیکھ کر آ رہے ہو گے؟ کچھ تو شرم کرو،اگلے ماہ تمھارا فائنل اکزام ہے۔ایک بار تو فیل ہو ہی گئے ہو۔کب تک یہ سب چلتا رہے گا۔'' شدتِ جذبات سے وہ کانپ رہے تھے۔

''اب ایسی غلطی نہیں ہو گی پاپا۔۔۔معاف کر دیجیے'' شاہد کے لہجے سے ندامت ٹپک رہی تھی۔

''ٹھیک ہے جاؤ۔۔کچن میں کھانا گرم کر کے کھالو۔''

مندرجہ بالا تحریر افسانے کے لیے موزوں ہے نہ کہ افسانچے کے لیے ۔ایک اچھا افسانچہ نگار اس کو ایسے برتے گا۔

دیر رات کو فلم کا آخری شو دیکھ کر لوٹے شاہد کو اُس کے ضعیف باپ نے خوب ڈانٹ پلائی۔'' کچھ تو شرم کرو۔اگلے ماہ فائنل اکزام ہے۔ایک بار تو فیل ہو ہی گئے ہو۔کب تک یہ سب چلتا رہے گا۔''

نادم شاہد کے معافی مانگنے پر کہ وہ اب ایسی غلطی نہیں کرے گا،اُس کے باپ نے اسے کچن میں رکھے کھانے کو گرم کر کے کھانے کی ہدایت کی۔

دیکھا آپ نے 120 الفاظ پر مشتمل افسانچے کے لحاظ سے غیر ضروری مکالمے کو کس خوبصورتی سے صرف 74 الفاظ میں سمیٹ دیا گیا ہے۔

اب ہم چلتے ہیں ''غیر ضروری'' تفصیلات کی طرف:

''مئی کا مہینہ تھا۔سخت گرمی پڑ رہی تھی ۔اُس کا سارا جسم پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ گرم ہوا کے جھونکے اُس کے چہرے کو جھلسا رہے تھے ۔ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی

تھیں۔ پیاس کی شدت سے گلے میں کانٹے پڑ رہے تھے۔ چاروں طرف ہو کا ماحول تھا۔''

افسانچے میں اتنی تفصیلات کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ مندرجہ بالا تفصیلات کو مختصر شکل میں اس طرح پیش کیا جاسکتا ہے۔

''مئی کا مہینہ تھا۔شدّت کی گرمی پڑ رہی تھی'' ایک ذہین قاری کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ وہ اپنی تصور کی آنکھوں سے دیکھ لے گا کہ مئی کے مہینے میں جب شدّت کی گرمی پڑ رہی ہوتی ہے تو ضرور اُس (افسانچے کے کردار) کا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا ہوگا، گرم ہوا کے جھونکے سے چہرہ جھلس گیا ہوگا، ہونٹوں پہ پپڑیاں جمی ہوں گی، پیاس کی شدت سے گلے میں کانٹے پڑ گئے ہوں گے۔ یہاں افسانچہ نگار کو اسے بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہی باتیں بے جا طوالت کا محرک بنتی ہیں۔

ایک کامیاب افسانچہ نگار کے پاس الفاظ کا ذخیرہ تو ضرور ہونا چاہیے۔تب ہی وہ طوالت کو قید کر سکے گا۔ لمبے جملے یا مخلوط الفاظ کے لیے ایک لفظ کی جانکاری افسانچہ نگار کو ہونی چاہیے۔ جیسے:

''اتنے میں لاش لے جانے والی گاڑی بھی وہاں پہنچ گئی'' (گیارہ الفاظ)

''اتنے میں ایمبولینس بھی وہاں پہنچ گئی'' (سات الفاظ) یہاں ''لاش لے جانے والی گاڑی'' پانچ الفاظ کے لیے اس کا متبادل ایک لفظ 'ایمبولینس' کا استعمال کیا گیا ہے۔ اُسی طرح 'چھپی ہوئی' کی جگہ 'پوشیدہ' 'ماں باپ' کی جگہ 'والدین' وغیرہ لکھنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔ ہاں ! کردار کی مناسبت اور واقعہ کی نوعیت کے مطابق مخفف الفاظ کے استعمال سے پرہیز کرنے کی صلاح دی جاتی ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ افسانچہ نگار کو نہایت باریکی سے افسانچے کو مختصر کرنے کی تراکیب اپناتے ہوئے کہانی کے زائد الفاظ یا جملے کو کم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

طوالت کے اختصار کے لیے ایک دل چسپ مثال پیش کی جاتی ہے، جسے آپ لوگوں میں سے بہتوں نے کبھی نہ کبھی ضرور دیکھا ہوگا۔ ایک راج مستری (Mason، جو اینٹ

اور گارے کی مدد سے دیواریں کھڑی کر کے اُس پر پلاسٹر بھی چڑھاتا ہے) سمینٹ اور بالو کے Mixture کو اپنی 'کرنی' (ایک اوزار جس کی مدد سے وہ پلاسٹر کا کام کرتا ہے) سے دیوار پر مسالہ چڑھاتا ہے۔ جب کافی مقدار میں میمنٹ اور بالو دیوار پر لتھیڑ دی جاتی ہے تو وہ اپنے گتے (ایک اوزار) کی مدد سے زائد اور بے ترتیب سیمنٹ کو گراتا جاتا ہے، جب تک کہ دیوار یکساں طور پر خوبصورت نظر نہ آنے لگے۔ یہی ترکیب افسانچہ نگار حضرات کو بھی اپنانی چاہیے۔ پہلے وہ اپنے پلاٹ پر الفاظ اور جملوں کا مکسچر لتھیڑ دے۔ پھر اپنی فنی چابکدستی اور اپنے skillful endeavour کے گتے کا استعمال کر زائد الفاظ اور جملوں کو تب تک سیمنٹ کی طرح گراتا جائے (مختصر کرتے ہوئے) جب تک خوبصورت دیوار کی طرح ایک خوبصورت افسانچے کی تعمیر نہ ہو جائے۔ زائد الفاظ اور جملوں کے تخفیف کرنے کا سلسلہ تب تک چلانا چاہیے کہ اگر مزید ایک لفظ یا جملہ کم کیا گیا تو ابہام پیدا ہو جائے اور اگر ایک لفظ یا جملہ نہیں کم کیا جائے تو غیر ضروری طوالت کا الزام لگ جائے۔ مندرجہ بالا اصولوں پر عمل کرتے ہوئے اگر ۱۲ سطور پر مشتمل کوئی افسانچہ (یہ صرف ایک مثال ہے) لکھا جائے تو وہ ایک کامیاب افسانچہ ہوگا۔ ہاں! اب اگر مذکورہ افسانچے میں کچھ الفاظ یا جملے کی تخفیف کر کے اُسے ۹ سطور پر لایا جائے تو ۱۲ سطور والا وہ افسانچہ غیر ضروری طوالت کا شکار کہلائے گا۔ خیال رہے کہ اتنا ہی مختصر کیا جائے جس سے افسانچے کے پیغام کی ترسیل اور کہانی پن مجروح نہ ہونے پائے۔ کہانی پن افسانچے کی روح ہے اور مجھے کہنے دیجیے کہ آج کل کے بیشتر افسانچے اس روح سے بے نیاز ہوتے جا رہے ہیں۔

مندرجہ بالا حقائق کے مطالعے سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ افسانچے کا سب سے بڑا وصف اس کا اختصار ہے۔ میں یہاں چند ترا کیب بتانا چاہوں گا جن کی مدد سے کوئی افسانچہ نگار کسی طویل تخلیق کو کس طرح اختصار کے ساتھ قلم بند کر سکتا ہے۔

﴾آپ اخبار کی کسی خبر (جو لگ بھگ 10-12 سطور پر مشتمل ہو) کا بغور مطالعہ کریں۔ پھر کم سے کم الفاظ میں اسے لکھنے کی کوشش کریں۔ لیکن شرط یہ رہے کہ خبر کی کوئی اہم

بات چھوٹنے نہ پائے۔

﴾ اپنا ہی کوئی طویل افسانچہ آپ اس کے لیے منتخب کر سکتے ہیں۔ جب آپ اس مضمون کی روشنی میں تخفیف کا قاعدہ اپناتے ہوئے اسے مختصر کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے تو یقین مانیے آپ کو بے انتہا خوشی محسوس ہوگی۔

﴾ اگر آپ کا کوئی افسانچے کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے تو آپ اپنے طویل افسانچوں کو مختصر کر کے اسے اپنے دوسرے ایڈیشن میں لگا سکتے ہیں۔ اس سے آپ کے افسانچوں کا معیار کافی بلند ہو جائے گا۔

﴾ یہ تجربہ آپ کسی دوسرے کے طویل افسانچوں یا منی کہانیوں پر بھی کر سکتے ہیں۔

میرا یہ مشورہ کچھ افسانچہ نگاروں کو ناگوار گزر سکتا ہے لیکن اس بات کا اعتراف کرنے میں مجھے کوئی جھجھک محسوس نہیں ہوتی ہے کہ میں ابھی بھی اس process پر عمل کرتا ہوں۔

Complete perfection in a peice of literature is next to immpossible اس لیے افسانچہ نگاروں کو چاہیے کہ وہ اپنے علاقے میں اس طرح کی کوئی تنظیم بنائیں جہاں افسانچہ نگار جمع ہو کر ایک دوسرے کے افسانچوں پر بے لاگ اور بے باک تجزیے پیش کریں۔ میری نظر میں سارے ہندوستان میں اس طرح کی ایک ہی تنظیم ہے جو "افسانہ کلب" کے نام سے مالیر کوٹلہ (پنجاب) میں واقع ہے۔

افسانچے کا اختتام اس کی پونجی ہے۔ جس طرح مناسب وقت پر پونجی کا صحیح استعمال قابلِ تعریف بات سمجھی جاتی ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی بیٹی کی سگائی میں کافی مال و دولت کی نمائش کرتا ہے اور شادی بالکل سادگی سے انجام دیتا ہے تو لوگوں کو یہ عمل متاثر نہیں کرتا ہے۔ اس لیے ایک کامیاب افسانچہ نگار کو چاہیے کہ وہ کلائمکس کی پونجی کو بچا کر رکھے اور صحیح وقت پر اس کا استعمال کرے۔ یہ سوچنے کی بات ہے کہ ایک مختصر سی تحریر میں وہ کون سی صفت ہے جو قاری کو متاثر کرتی ہے۔ زبان و بیان کی لطافت، مکالمے کی اہمت، جذبات کی جزئیات نگاری اور تفصیلات کی چاشنی یہ سارے افسانے کی خصوصیات ہیں۔ ان کا افسانچے میں کوئی

کام نہیں بلکہ ان کی موجودگی افسانچے کو بے جا طوالت کے دلدل میں دھکیلنے کے مترادف ہیں۔بس ایک اختتام ہی وہ پونجی ہے جو کسی افسانچے کو ابدیت بخشتی ہے۔

اب ہم افسانچے کے عنوان کی طرف رُخ کرتے ہیں۔میرا ماننا ہے کہ اگر کسی افسانچے کو مکمل کرنے میں تین گھنٹے لگتے ہیں تو اُس کے عنوان کا انتخاب تین سے زائد گھنٹوں میں کیا جانا چاہیے۔اس سلسلے میں سب سے اہم بات یہ ذہن نشیں کرنی چاہیے کہ عنوان ایسا کبھی نہ رکھیں کہ جس سے اختتام کا پتا چل جائے۔ بلکہ اس کی بھنک بھی قاری کو محسوس نہ ہو سکے۔اگر کوئی افسانچہ نگار ایسا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو قاری کو افسانچے کا اختتام ''غیر متوقع'' معلوم ہوگا۔ایسی حالت میں قاری کو افسانچہ پسند کرنے سے کون روک سکتا ہے؟

اب اگر کوئی مجھ سے مختصر میں افسانچے کی تعریف پوچھے تو میرا جواب ہوگا:

''غیر ضروری تفصیلات، مکالمے اور تکرار سے بچتے ہوئے، قارئین تک افسانے کے پیغام کی ترسیل کرتے ہوئے، کہانی پن کو مجروح کیے بنا، بونسائی کی طرز پر افسانے کے تمام لوازمات کو سمیٹتے ہوئے وجود میں آنے والی تحریر کو 'افسانچہ' کہتے ہیں۔''

کامیاب افسانچے کی خوبیاں

محمد بشیر مالیر کوٹلوی

ماں نے ایک بچے کو جنم دیا اور چل بسی۔اس کے بعد وہ چھوٹا سا بچہ لاوارث ہو گیا۔ اس کی طرف کسی آنکھ نے نہیں دیکھا نہ کسی نے اس کی پرورش کی ذمے داری لی۔وہ غیر اہم سا بچہ لوگوں کی بے توجہی کا شکار ہو گیا اور اپنی ننھی سی بیت اٹھائے یوں ہی بھٹکتا رہا۔خاموش اور تنہا، پھر ایک انسان نے اسے بھر پور نظر سے دیکھا اور بچے کے مستقبل پر غور کیا، کچھ سوچ کر بچے کو اٹھالیا۔اسے نہلایا دھلایا، اچھے کپڑے پہنائے، سجایا سنوارا اور اس کی جسامت کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے ایک نام بھی دے دیا۔

گھبرایئے نہیں میں آپ کو کوئی کہانی سنانے نہیں جا رہا ہوں۔یہ آپ بیتی ہے اردو افسانچے کی جس کو جنم دیا سعادت حسن منٹو نے، سجایا سنوارا جوگندر پال نے اور گود میں کھلایا رتن سنگھ نے۔اتفاق سے تینوں کا تعلق میرے پنجاب سے ہی تھا جس پر ہم پنجابیوں کو فخر ہے۔ماضی بعید میں افسانچے کی قدر و قیمت اس لیے بھی نہیں تھی کہ لوگ اس وقت داستانوں کی تصوراتی دنیا سے نکل کر آئے تھے اور طویل کہانیوں کا مزہ لے رہے تھے۔کیوں کہ اس وقت زندگی آسان تھی اور لوگوں کے پاس کافی وقت تھا۔زندگی کی رفتار اس قدر تیز نہ تھی جتنی کہ آج ہے۔یوں محسوس ہوتا ہے کہ دور حاضر کا قاری افسانہ نگار سے کہہ رہا ہے کہ بھئی تمھاری اس شاعرانہ منظر نگاری، لفاظی اور لمبے لمبے مکالموں کے لیے میرے پاس وقت نہیں اور نہ ہی میں علامتوں میں الجھنے کا خطرہ مول لے سکتا ہوں۔

''یار...! جو کہنا ہے جلدی سے کہہ ڈالو، مجھے کام پر جانا ہے، میں جلدی میں ہوں...''

افسانہ نگار کتنا ہی خوددار ہو، بے باک ہو، نک چڑھا ہو قاری کے بغیر بہر حال ادھورا ہے قاری اور ادیب کا رشتہ لازم وملزوم ہوتا ہے۔ وقت اور حالات کو دیکھتے ہوئے افسانہ نگاروں نے افسانچے کو اپنایا۔

حالانکہ جب افسانچے نے ''سیاہ حاشیے'' کی شکل میں آنکھیں کھولیں اس وقت قاری کے پاس وقت کی کمی نہ تھی۔ قلم کار کو قاری سے اپنا رشتہ بنائے رکھنا تھا، اس کی مصروف زندگی سے کچھ پل ہی سہی، حاصل کرنے تھے، کیوں کہ وہ سخت تخلیقی عمل سے قاری کے لیے ہی تو گزرتا ہے۔ ان حالات کے پیش نظر افسانچہ کی اہمیت کو محسوس کیا گیا۔ آیئے غور کریں کہ افسانچہ کیسا ہونا چاہیے؟

ماہنامہ شمع میں شائع ہوئے افسانچوں کے نقوش آج بھی اردو والوں کی یادوں کے البم میں موجود ہیں۔ اس لیے کہ وہ معیاری افسانچے اور منی کہانیاں ہوا کرتی تھیں۔ ان کو پڑھ کر قاری چونک جاتا تھا۔ میرے نزدیک کامیاب افسانچے کی خوبی یہی ہونی چاہیے کہ وہ قاری کو اپنی اسی ہیئت سے جھنجھوڑ کر رکھ دے۔ پٹاخہ چھوٹی سی چیز ہوتی ہے مگر جب وہ پھٹتا ہے تو اپنے اردگرد کے ماحول کو ہلا کر رکھ دیتا ہے۔ اس صنف کے موجد کو بھی شاید اس بات کا احساس نہیں تھا کہ ''سیاہ حاشیے'' کی شکل میں وہ اردو ادب کو 32 پٹاخے دے رہے ہیں۔ ان میں سے ایک پٹاخہ ملاحظہ فرمائیں۔

سوری

چھری پیٹ چاک کرتی ہوئی ناف کے نیچے تک چلی گئی۔ آزار بند کٹ گیا۔ چھری مارنے والے کے منہ سے دفعتاً کلمہ تاسف نکلا۔ ''چ، چ، چ، چ، مشٹیک ہو گیا۔''

❖❖

منٹو استاد کا یہ افسانچہ پڑھ کر آپ پر کیا کیفیت طاری ہوئی۔؟ یقیناً یہ پٹاخے کی طرح آپ کے ذہن میں پھٹا ہے اور آپ کو افسانچہ یقیناً جھنجھوڑ گیا ہوگا۔ بس... یہی... یہی وصف

ہونا چاہیے ایک کامیاب افسانے کا۔ وہ افسانچہ کیا جو آپ کے رونگٹے کھڑے نہ کر دے آپ کو سوچنے پر مجبور نہ کر دے۔ افسانچے میں ایک سسپنس چھپا ہوتا ہے جسے آپ کو قاری کے سامنے کھولنا ہوتا ہے۔

آیئے اس افسانچے کی گرہ کا جائزہ لیں۔ یہاں یہ گرہ استاد نے آخری دو لفظوں سے کھولی ہے۔ ''مشٹیک ہو گیا'' یہ منٹو کا خاص ٹریٹمنٹ تھا کہ وہ اپنے کرداروں کے ساتھ ناانصافی کبھی نہیں کرتا تھا۔ کردار پنجابی ہو تو بے دریغ پنجابی الفاظ استعمال کرتا تھا۔ اس کو تخلیق کرتے ہوئے یہ احساس ہی نہیں رہتا تھا کہ جب یہ افسانہ بنگال یا حیدرآباد میں پڑھا جائے گا تو قاری پر کیا بیتے گی؟ بہر حال بات ہو رہی تھی ''مشٹیک ہو گیا'' آپ کے ذہن میں سوال اٹھا۔

کیا مسٹیک ہو گیا....؟

ظاہر ہے زیر ناف مذہب کی شناخت چھپی ہی رہتی ہے۔ آزار بند کھلا تو قاتل پہ یہ راز کھلا کہ مقتول کا مذہب کیا تھا، لفظ 'مشٹیک' اس بات کو چیخ چیخ کر بتا رہا ہے کہ قاتل اور مقتول کا مذہب ایک تھا۔ 'مشٹیک' ہو گیا نے گرہ کھول دی۔ میں یہاں دور حاضر کے تین افسانچوں کی اور مثالیں پیش کروں گا، افسانچہ نگاروں کا ذکر نہیں کروں گا۔ اگر یہ افسانچے مقبول ہیں تو ان کے نام آپ جانتے ہی ہوں گے۔ آیئے ملاحظہ فرمائیں۔

مجرم

میری بیٹی ٹرین کے باتھ روم سے واپس آتے ہی مجھ سے بولی۔
پاپا...! آپ ابھی تک غلط ہندی لکھتے ہیں اور میں..... دوہری شرم سے گڑ گیا۔

❖❖

اس افسانچے کو دیکھیے: عام موضوع ہے۔ کتنی بار ہم ٹرین کے باتھ روم میں جاتے ہیں اور لوگوں کی بدتمیزیاں دیکھتے ہیں۔ اس عام موضوع کو افسانچہ نگار نے کیسے پروسا کہ اس میں تجسس پیدا کر دیا۔ اس میں ایک گرہ ہے جو آپ کے سامنے جادوئی طور پر کھلتی ہے اور میں

دوہری شرم سے گڑ گیا۔ اقبال جرم اور احساس جرم، پشیمانی دونوں سامنے آ گئے۔ جب ایک بیٹی باپ سے کہے گی۔

''پاپا آپ ابھی تک غلط ہندی لکھتے ہیں.....''

تو باپ کا پشیمان ہونا قدرتی ہے۔ افسانچہ نگار یہاں بیٹی کی جگہ بیٹا بھی لا سکتا تھا، مگر احساس گناہ اور شرمندگی بیٹی کے سامنے وزن رکھتی ہے۔ اس لیے باپ اپنی مشٹیک پہ شرمندہ ہوگا ہی۔ ہوگا۔ اس افسانچے کی گونج ہمارے اندر کہیں نہ کہیں موجود رہے گی۔ ایک افسانچہ اور دیکھیے:

وارننگ

''یہ کیا کیا تم نے...داڑھی رکھ لی...!؟''

''ہاں بھئی داڑھی رکھنا سنت ہے...اور ثواب بھی...''

''یہ شرعی معاملہ ہے۔ میاں... یہاں اگر مگر کی گنجائش نہیں...''

''لیکن...آپ جہاں جاؤ، اپنا آئی کارڈ جیب میں رکھ لینا...''

❖❖

موضوع تو یہ بھی عام ہے۔ لوگ داڑھی رکھتے اور منڈواتے ہیں کوئی خاص بات نہیں۔ پہلے ہی مکالمے ہیں تجسس ہے اور سوال کی چبھن ہے۔ سوال کا جواب ہے۔ تیسرے مکالمے میں پھر حیرانی کہ سوال کرنے والا وجہ بتانے پر بھی داڑھی رکھنے والے سے مفاہمت پیدا نہ کر سکا۔ سوال جوں کا توں گرہ اور مضبوط، پٹاخہ جب پھٹتا ہے جب داڑھی کے سوال کا حل آئی کارڈ بن جاتا ہے۔ اس دور کے مسلمانوں کو 9/11 کے حادثہ کے بعد اسلام دشمنوں نے ایک مکروہ شناخت دے دی ہے، وہ ہے دہشت گردی۔ آئی کارڈ کا مشورہ اس لیے دیا گیا کہ اگر آپ کلین شیو ہو تو آپ کی شناخت مشکوک نہیں۔ شرعی داڑھی رکھنے کے بعد آپ کو اپنے آئی کارڈ سے ثابت کرنا ہوگا کہ آپ واقعی آپ ہو، کوئی غلط انسان نہیں ہو۔

MY NAME IS KHAN, BUT I AM NOT TERRORIST

المیہ کی اپج ہے۔ ایک اور افسانچہ ملاحظہ فرمائیں:

محلے کے بچے

اس کے بچوں سے سارا محلّہ پریشان تھا۔
اس نے تنگ آکر اپنے بچوں کو دینی مدرسے میں ڈال دیا۔
وہ فارغ ہوکر لوٹے تو سارا شہر پریشان ہے۔

❖❖

بچّے شریر تھے جن سے محلّہ پریشان تھا۔ باپ نے پریشانی کا حل نکالا، بچوں کو مدرسہ میں ڈال دیا۔ بچے جب مدرسہ سے فارغ ہوکر آئے تو شہر پریشان ہو اٹھا۔ یہاں فسانچہ نگار نے سب کچھ قاری پر چھوڑ دیا، اُس کا ذہنی امتحان لینے کے لیے۔ یہاں جو گرہ ہے وہ قاری کو کھولنی ہے۔ چلیے ہم مل کر کھول لیتے ہیں، اس گرہ کو۔ بچّے مدرسہ سے فارغ ہوکر آئے تو شہر والوں کی اصلاح کرنے لگے۔ صوم وصلوٰۃ کی دعوت دینے لگے اور غلط کاموں سے منع کرنے لگے۔ ظاہر ہے ان کی تبلیغ کی شدت سے شہر پریشان ہو اُٹھا۔ یہ ہے کامیاب افسانچہ اور تجسس بھرا فن پارہ۔

میں پھر واپس لوٹتا ہوں، جیسا کہ آپ نے تین افسانے دورِ حاضر کے اور ایک افسانچہ ''سیاہ حاشیے'' کا دیکھا۔ افسانچہ وہ ہی کامیاب ہوتا ہے جس کے چھوٹے سائز میں بھی بڑے افسانے کا مزہ ہو۔ افسانچہ تبھی مقبول ہوگا جب اس چھوٹی سی پوٹلی میں تمام لوازمات موجود ہوں گے۔ افسانچہ وہی کامیاب ہوتا ہے جس میں آخری مرحلے تک تجسس قائم رہے، اختتام پر دھماکہ ہو اور قاری سوچنے پر مجبور ہو جائے۔

موضوع عام ہو یا روٹین کی بات ہو اس کی پیش کش، ایک ایسے پہلو کی پیش کش ہو جس پر کسی کی نظر نہ ہوگئی ہو، اُس کو شاہکار بنا دیتے ہیں۔ موضوع افسانچے کی روح ہے اور روح کے بغیر انسان بھی لاش کہلاتا ہے۔ ہم روزانہ بہت سی فضول باتیں کرتے ہیں، لوگ ان کو بے توجہی سے سنتے ہیں۔ ہم اگر کوئی عجیب وغریب بات کریں، سنسنی خیز واقعہ سنائیں تو لوگ اپنے ہاتھ کا کام چھوڑ کر ہماری بات سنتے ہیں اور اس بات پر تذکرہ بھی کرتے ہیں۔ انگشت بدنداں بھی ہوتے ہیں۔ کف افسوس بھی ملتے ہیں۔ بات مزاحیہ ہو تو قہقہے بھی لگاتے

ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ کہ اس بات کی نوعیت کے مطابق آدمی پر اثر ہوتا ہے۔سوال یہ ہے کہ آخر ایسے موضوعات ملتے کہاں پر ہیں؟...اور کب...؟

ایسے موضوعات بکھرے پڑے ہیں،سوال ان کو چننے کا ہے۔حاصل کرنے کا ہے۔ اب دیکھیے ٹرین کے باتھ روم میں دنیا جاتی ہے اور گندے کارٹون اور لکھے ہوئے غیر اخلاقی جملے بھی پڑھتی ہے۔مگر ایک ذی ہوش ادیب نے اسی بات کو ایک موضوع بنا دیا۔اس میں اچھوتا پن پیدا کر کے سماج کے منہ پر ایک بھر پور تھپٹر جڑ دیا۔یہی صلاحیت خدا کی دَین ہے، جسے وہ ہر روح کو نہیں بخشتا۔وہ اسے دیتا ہے جس پر وہ مہربان ہو۔مدرسے میں لوگ بچوں کو پڑھاتے ہیں۔ بچے مدرسے سے فارغ ہو کر بھی آتے ہیں۔اس کو افسانچے میں ڈھالنا، تجسس پیدا کرنا، ایک ادیب کا ہی کام ہے۔ایک سچے ادیب کا، جس کے اندر خداداد صلاحیت موجود ہو۔ 1947 میں لاکھوں لوگوں کا قتل ہوا مرنے والے اِدھر بھی مرے اُدھر بھی۔ تقسیم کے موضوع پر بہت سے ادیبوں نے قلم اٹھایا۔لیکن منٹو نے ہی ایسے ڈھنگ سے باتیں کیوں کی جنھیں پڑھ کر آج بھی ہمارے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔کیوں کہ منٹو فن کی صلاحیتوں سے مالا مال تھا۔

یاد رکھیے...فن کار ہوا کرتے ہیں بنا نہیں کرتے۔

ماہنامہ شمع دہلی، روبی، فلمی ستارے و دیگر جرائد نے پچھلی صدی کے ساتویں، آٹھویں بلکہ نویں دہائی تک منی کہانی اور افسانچے کی خدمت کی ہے۔دور حاضر میں افسانچوں کو تقویت ملی۔افسانچوں کا جیسے طوفان آ گیا۔کہیں سے آواز آ رہی ہے میں نے دو ہزار افسانچے لکھے، کوئی کہتا ہے پانچ سو سے زائد لکھ چکا،کسی کے افسانچوں کے دو مجموعے شائع ہو چکے۔ایسے بہت سے لوگ سامنے آ رہے ہیں جو افسانوی ادب میں ابھی تک پیدا نہیں ہوئے لیکن افسانچوں کی کئی کتابوں کے خالق ہیں۔میرے جیسے کچے پکے ادیبوں نے ان کی تعریف میں مضامین بھی لکھے۔ان کے بے معنی اور سطحی افسانچے، کسی طرح سے کچھ مدیران کو خوش کر کے کئی جرائد میں جگہ بھی پا چکے اور ایسے تھوک میں افسانچے پروڈکٹ کرنے والے جوڑ توڑ لگا کر

ایوارڈ بھی لے گئے۔اب ان کو ایسی ہی محفلوں میں صدارتی مسند پر بھی بٹھایا جانے لگا ہے۔ افسانچے کے لیے ایسے لوگ خوش قسمتی کی علامت ہیں یا بد قسمتی کی...؟ یہ لمحۂ فکر یہ ہے۔

آپ کی اطلاع کے لیے عرض کر دوں کہ ایک معیاری جریدہ جو افسانچوں کے تین چار نمبر نکال کر افسانچوں کی کافی خدمت کر چکا تھا اب اس نے افسانچے شائع کرنے سے توبہ کر لی ہے۔ جب ہم نے مدیر صاحب سے رابطہ قائم کیا اور پوچھا کہ بھائی آپ تو خود بھی افسانچے تخلیق کرتے ہیں یہ اچانک افسانچوں سے دوری کیوں...؟ جواب ملا، کس کس کو چھاپا جائے میرے پاس پانچ سو افسانچے آئے پڑے ہیں جن کے خالق فون کر کے اور سفارش کروا کر پریشان کر رہے ہیں۔ ہم نے کہا بھائی آپ افسانچے شائع کرنے سے توبہ مت کیجیے، ان پانچ سو افسانچوں میں سے پچاس کا انتخاب کر کے چھاپ دیجیے، ان میں سے بیس تو معیاری نکل ہی آئیں گے۔ جواب ملا حضور میرے پاس وقت نہیں کہ میں پانچ سو افسانچے پڑھوں اور ان کا معیار پرکھوں۔ آپ لوگ افسانچہ اکادمی کا کوئی جریدہ نکالیے اور افسانچے چھاپیے۔

اب ایک سوال میں نے خود سے کیا کہ اگر افسانچہ اکادمی ڈرگ کوئی جریدہ جاری کرتی ہے تو کیا وہ بے معنی اور غیر معیاری افسانچوں کو برداشت کر پائے گی...!؟ ہرگز نہیں۔ اگر غیر معیاری افسانچوں کی اشاعت افسانچہ اکادمی نے کی تو اکادمی کا تو مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ اکادمی کا مقصد تو افسانچے کا معیار بلند کرنا ہے، اس کی عظمت بڑھانا ہے، اس کو فروغ دینا ہے۔ اسی طرح لکھنؤ سے نکلنے والا ایک اور معیاری پرچہ اپنے ایک شمارے میں اعلان کر چکا کہ اشاعت کی غرض سے افسانچے نہ بھیجیں۔ افسانچے کے زوال کے سائے جو ہماری طرف بڑھ رہے ہیں، اس کا ذمے دار کون ہے؟ ظاہر ہے تھوک کے بھاؤ میں افسانچے تخلیق کرنے والے ہم، بغیر سوچے سمجھے غیر معیاری اور بے معنی کتابیں محض پیسے کے زور پر شائع کروانے والے ہم....!

میرا ماننا ہے، ممکن ہے آپ بھی اس بات پر اتفاق کریں کہ معیاری افسانچہ وہی ادیب تخلیق کر سکتا ہے جو افسانے کے رموز سے اچھی طرح واقف ہو، عصری تقاضوں کو سمجھتا ہو اور

اپنے دور کے قاری کے مزاج سے بھی آگاہ ہو۔ یہ بھی شرط ہے کہ افسانوی ادب میں قابل قبول ہو۔ یہ نہیں کہ ایک دو مقامی اخباروں میں چھپ گئے اور افسانہ نگار ہونے کی تختی لگالی۔ یاد رکھیے افسانچہ تخلیق کرنا افسانہ تخلیق کرنے سے مشکل کام ہے۔ سمندر کو کوزے میں عام قلم کار بند نہیں کرسکتا۔

اس محاورے کو ہی پرکھیے۔ کوزہ اور سمندر یعنی کوزے میں بند ہو کر بھی سمندر، سمندر ہے تب بات کا مزہ ہے۔ ویسے بھی زیادہ باتونی انسان کی باتوں میں اثر نہیں ہوتا، کم گو انسان جب بھی بولے گا، ناپ تول کر بولے گا اور باوزن بات کرے گا۔ افسانچہ کے تھوک بیوپاریوں کے لیے یہ مثال کافی ہے۔

واضح ہونا چاہیے کہ چھوٹا موٹا ہر واقعہ یا روٹین کی باتیں افسانچے کا لباس نہیں پہن سکتیں۔ ایسا ہوتا ہے، مگر اس کے لیے تجربہ چاہیے، افسانچے کے نشیب و فراز کو سمجھنے کی صلاحیت چاہیے۔ آج کل اخبار و رسائل میں چھپنے کا دوستوں نے آسان راستہ ڈھونڈ لیا اور اس طرح کے بے معنی افسانچے لکھ کر افسانچے کی مقبولیت کو نقصان پہنچانے لگے ہیں۔

گھنٹی

استاد نے اسکوٹر اسٹینڈ پر لگایا اور اسکول میں داخل ہوا۔ گھنٹی کب کی بج چکی تھی۔

❖❖

افسانچہ ہوگیا۔ ایسے افسانچہ تخلیق کار پہلے اپنی بیوی کو سنا کر خوب داد وصول کرتا ہے۔ بچے جوان ہیں تو ان کو سناتا ہے۔ دوستوں اور رشتہ داروں سے خوب خوب داد وصول کرتا ہے۔ کوئی کہتا ہے۔

"واہ صاحب واہ! کیا بہترین افسانچہ ہے چھٹی کو یہاں آپ نے علامت کے طور پر پیش کیا ہے۔"

کوئی کہتا ہے، یہ ہے سماج پر چوٹ۔

اور کوئی کہتا ہے، احتجاج سے بھرپور ہے صاحب۔

پھر صاحب افسانچہ کسی ادیب کو سناتا ہے تو وہ بھی اس کا دل رکھنے کے لیے تعریف کردیتا ہے۔ یہ سوچ کہ چلو کیسے بھی سہی، اردو ادب کی خدمت تو ہو رہی ہے۔ ویسے بھی

ادیب بھائی شریف اور وضع دار ہوا کرتے ہیں۔ کسی کا دل نہیں توڑتے۔نو آموز افسانچہ نگار غلط فہمی کا شکار ہو جاتا ہے اور اس طرح کے افسانچے دس بیس کے حساب سے روزانہ تخلیق کرنے لگتا ہے۔سو دو سو افسانچے ہوئے تو صاحب مجموعہ چھپوانے کے لیے کوشش شروع کر دیتے ہیں۔ کسی طرح سے بڑے ادیبوں سے یا خود ساختہ افسانہ نگاروں سے اپنے فن پر مضامین بھی حاصل کر لیتا ہے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ قوم بڑی وضع دار اور شریف النفس ہوا کرتی ہے۔ کتاب چھپ گئی تو لگ گئی ادب میں سیندھ بن گئے افسانہ نگار، افسانچے کے استاد۔اب دھوم دھام سے کتاب کا اجرا ہوتا ہے۔

ذرا سوچیے ہم کسی کے لیے عرق ریزی کر کے ادب تخلیق کرتے ہیں۔ کُرۂ عرض پر پھیلے ہوئے اردو ادب کے قارئین اکرام کے لیے، جن کی تعداد دن بدن کم ہوتی جا رہی ہے۔آج کا انسان اپنی مجبوریوں کی بنا پر دن بدن کتابوں سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ایسے میں اگر ہم اس کے سامنے غیر معیاری و غیر دل چسپ ادب پروسیں گے، تو وہ مطالعہ سے اور دور نہیں ہو جائے گا؟ کیا آنے والا وقت ہمیں معاف کرے گا؟ اکتایا ہوا قاری افسانچہ سے بدظن ہو جائے گا، ماضی قریب میں علامتی اور تمثیلی افسانوں کا حال آپ دیکھے چکے ہیں۔ قاری علامتوں کی الجھنوں سے اکتا گیا تھا۔آج بھی کچھ زیادہ پڑھے لکھے ادیب علامتوں کی الجھنوں میں پھنسے نظر آتے ہیں۔ جبکہ قاری کی پہلی پسند بیانیہ افسانہ ہی ہے۔ بہر حال علامتی افسانے اپنے ماتھے ناپسندیدگی کا داغ لیے کب کے جا چکے۔خدا نہ کرے افسانچے کا بھی ایسا ہی حال ہو، جس کو ہم نے چھ دھائیوں سے سنبھال کر رکھا ہے۔

آیئے غور کریں کہ افسانچہ کیسا ہو اس میں کیا خوبیاں ہونا ضروری ہیں۔ پہلے موضوع کی بات کرتے ہیں جیسے میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ خاص طور پر نئے لکھنے والے افسانچے کا موضوع اچھوتا، عام روش سے ہٹ کر چونکا دینے والا اپنائیں۔ایسا موضوع دل چسپ اور قابل قبول ہوتا ہے۔روزانہ کی عام باتوں سے ہلکی پھلکی باتوں سے افسانچے کے لیے موضوع نہیں اٹھانا چاہیے۔اہل فن کبھی کبھی عام باتوں سے بھی انوکھا پن پیدا کر دیتے

ہیں۔ یہ بہتر اسلوب سے ہی ممکن ہوتا ہے اور اسلوب آتے آتے ہی آتا ہے۔ بہر حال عام آدی سے ادیب کا مزاج مختلف ہوتا ہے۔ وہ حساس ہوتا ہے، ہر بات کو باریک بینی سے دیکھنے کا عادی ہوتا ہے۔ وہ عام باتوں میں بھی تجسّس پیدا کر دیتا ہے اور سنسنی پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بات موضوع کی ہو رہی تھی۔ موضوع افسانچے کی روح ہوتا ہے۔ ہمارے اندر اگر صحیح موضوع چننے کی صلاحیت ہے تو پھر ہم افسانچہ نگار ہیں۔

اگر ہم چلنے پھرنے، گاڑی میں سوار ہونے، دانت کریدنے، سیڑھیاں چڑھنے، جیسے موضوعات اپنائیں گے، اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم دن میں بیس پچیس افسانچے تو گھڑ ہی لیں گے اور ایسے افسانچے یقیناً عام قاری کی بے توجہی کا شکار ہوں گے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم پیسوں کی بدولت افسانچوں کا مجموعہ چھپوالیں گے، مگر اپنی اس تخلیقات کو اردو ادب میں کوئی مقام نہ دلا پائیں گے۔

دور حاضر میں معاملہ ہی کچھ اور ہو گیا، ہم کسی جریدے میں چھپیں یا نہ چھپیں ہماری کتاب مارکیٹ میں ضرور آجاتی ہے۔ یاد رکھیے کتاب کے حوالے سے آپ کم سے کم آنے والے سو سال تک لوگوں کے ہاتھوں میں رہیں گے کیا آپ چاہیں گے۔ سطحی افسانچوں کو پڑھ کر آنے والی نسلیں آپ کا مذاق اڑائیں۔ اس لیے آپ سے گزارش ہے کہ آپ کامیاب افسانے پڑھیے۔ ان کے موضوعات اور ان کے اسلوب کو دیکھیے اور سوچ سمجھ کر افسانچہ تخلیق کیجیے تا کہ اس میں کشش ہو، انوکھا پن ہو، معیاری بات ہو۔ موضوعات کے ساتھ ساتھ افسانچے کو اُس کا اسلوب بھی افسانچہ بناتا ہے۔ ہم کتنا ہی بہتر موضوع چن لیں جب تک اس کو اسلوب نہیں ملتا وہ تشنہ اور نامکمل ہی رہتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ہم اپنی پسند کا قیمتی اور بہترین کپڑا خرید کر لائیں اور اناڑی درزی کو دے دیں ظاہر ہے درزی کپڑا بگاڑ دے گا کیونکہ اسے کپڑا اچھی طرح سینا ہی نہیں آتا۔ وہ کپڑا سینے کے فن سے واقف ہی نہیں۔ گھٹیا سلا ہوا کپڑا آپ پہنیں گے تو ہر دیکھنے والا درزی پر لاحول بھیجے گا اور مشورہ دے گا کہ بھائی کسی اچھے درزی سے سلوا لیا ہوتا، جو اس کام سے اچھی طرح واقف ہوتا۔

افسانچے کی تخلیق میں بھی صحیح اور بہتر اسلوب درزی کا کام کرتا ہے۔ موضوع کو سجاتا ہے سنوارتا ہے اور آپ کی شان بڑھاتا ہے۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں، افسانچے کے ابتدائی جملے چاہے وہ ایک ہی ہو پرکشش ہونے چاہیں تاکہ قاری آپ کی تخلیق کے سحر میں پھنس جائے اور اُسے مزید جملے پڑھنے کی طلب ہو۔ جیسے اس جملے کو پڑھ کر تشنگی جاگی۔

''چھری پیٹ چاک کرتی ہوئی ناف کے نیچ تک چلی گئی....''

ایک جملہ پڑھ کر قاری کا ذہن آپ کے قابو میں آجاتا ہے تو آپ کامیاب ہیں، قاری آگے جاننے کی سعی کرے گا اور دوسرا جملہ پڑھے گا۔''آزار بند کٹ گیا''بس قاری کے لیے ایک تجسس ایک سسپنس پیدا ہو گیا۔ اس کے ذہن میں سوالات اٹھنے لگے۔ کس نے قتل کیا...؟ کون قتل ہوا...؟ اور کیوں...؟ آزار بند کھلا تو کیا راز افشا ہوا؟ قاری تجسس میں ہے اور آپ کے تخلیقی سحر کے زیر اثر بھی آپ نے اچانک گرہ کھول دی اور سب کچھ ظاہر ہو گیا۔ اب آپ سب کچھ قاری پر چھوڑ کر ایک طرف ہو جایئے آپ کا کام ختم، اتنا ہی کافی ہے۔

''چھری مارنے والے کے منہ سے کلمہ تاسف نکلا... مشٹیک ہو گیا...''

قاری کا چونکنا یہاں قدرتی ہے۔ قاری کے دل و دماغ میں دھماکہ ہوا۔ وہ سوچنے پر مجبور ہے کہ قاتل نے کیوں کہا کہ مشٹیک ہو گیا...؟ آخر قاری کو کون کی شناخت زیر ناف ملی کہ اسے افسوس ہوا۔

''مشٹیک ہو گیا...''

یقین مانیے ہم بے معنی اور ہلکے پھلکے افسانچے تخلیق کر کے افسانچے کی شکل کو مسخ بنا رہے ہیں۔ اس کی مقبولیت میں رکاوٹ پیدا کر رہے ہیں۔ مجھے کہنے دیجیے کہ ہم افسانچے کے دوست نہیں دشمن ہیں۔ ہم انجانے میں اس ننھی سی صنف کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ آج مقبول افسانہ نگار حضرات افسانچے سے کنی کاٹ رہے ہیں۔ وجہ یہ بھی ہے کہ تھوک میں افسانچے لکھنے والوں نے اسے ہلکی پھلکی اور غیر معیاری صنف بنا ڈالا۔ میں

یہاں کچھ دوستوں کے نام لے رہا ہوں جن کا افسانوی دنیا میں نام ہے اور وہ افسانچے کی تخلیق سے پرہیز کرتے ہیں۔ مثلاً نورالحسنین، سلام بن رزاق، انور قمر، شوکت حیات، عابد سہیل، مشرف عالم ذوقی، مقدر حمید، احمد صغیر وغیرہ۔ یہ بات قابل غور ہے کہ دہلی نے کوئی افسانچہ نگار ابھر کر نہیں آ رہا۔ کچھ ادیب تو افسانچہ کو ادبی صنف ماننے کو تیاری نہیں۔ ظاہر ہے کہ ہم افسانچہ کو قبول کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ مستند افسانہ نگار حضرات، جو قارئین کی پسند ہیں، کو افسانچے کی طرف راغب کرنا ہوگا۔ یہ تبھی ممکن ہے جب ہم اپنی اصلاح کریں گے سوچ سمجھ کر موضوع اٹھائیں گے صحیح ڈھنگ سے اس کو ٹریٹمنٹ دیں گے، اس کی تکنیک کو سمجھیں گے۔ افسانچہ تخلیق کیجیے اور کسی ایسے دوست سے مشورہ کیجیے جو افسانے اور افسانچے کے رموز سے واقف ہو۔

ایسے سینئر ادبا جو شرافت اور وضع داری کی وجہ سے بے معنی افسانچوں پر تعریفی مضامین لکھتے ہیں۔ وہ افسانچے کو زیادہ نقصان پہنچا رہے ہیں۔ افسانچہ نگار کو کھل کر بتائیں کہ اس کا معیار کیا ہے وہ کیسے افسانچے تخلیق کر رہا ہے، اچھے یا برے، بھلے افسانچہ نگار برا ہی مان لے۔ آپ اس افسانچہ نگار پہ صحیح تنقید کر کے اس صنف کا بھلا کریں گے۔ نئے افسانچہ نگاروں کو بھی تنقید کا برا نہیں ماننا چاہیے۔ اس سے ان کے فن پر نکھار آتا ہے۔ بہتر لکھنے کی تحریک ملتی ہے۔ یاد رکھیے انسان کو آخری دم تک سیکھنا چاہیے۔

مکمل تو صرف اللہ کی ذات ہے۔ تنقید کو خندہ پیشانی سے قبول کر لینا اچھے فن کار کا کام ہے۔ جب آپ اپنے تخلیق کردہ افسانچے سے مطمئن ہوں تو کسی ادبی جریدے کو اشاعت کی غرض سے بھیجے۔ اگر مدیر اسے شائع کرتا ہے تو آپ کی تحقیق میں دم ہے۔ اشاعت کے بعد جب اسی جریدے میں آپ کی تعریف میں خطوط چھپیں تو عام قاری نے آپ کو قبول کر لیا۔ آپ واقعی کامیاب افسانچہ نگار ہیں۔

جیسے صندوق سے صندوقچہ، کتاب سے کتابچہ اور افسانے سے افسانچہ یعنی افسانے کا چھوٹا سائز، سائز چھوٹا مگر تاثر ویسا ہی جتنا افسانے کا۔ کہنے کا مطلب یہ کہ افسانچہ ایک ننھی منی

صنف ہے۔ اسے تخلیق کرتے وقت ہمیں اس بات کا خیال رکھنا ہے کہ افسانچہ اتنا نہ بڑھ جائے کہ منی افسانہ بن جائے۔ منی افسانہ یا منی کہانی، افسانے اور افسانچے کے درمیان کا سائز ہے۔ پچھلے دنوں ’شاعر‘ ممبئی کے مدیر جناب افتخار امام صدیقی نے افسانچے کا ایک پیمانہ دیا تھا۔ افتخار بھائی ظاہر ہے بہت ذہین انسان ہیں اور خود بھی افسانچے تخلیق کرتے ہیں۔ انھوں نے افسانچے کے حروف کا پیمانہ باندھا تھا۔ الف سے لے کر یے تک افسانچے میں سات حروف میں، ’اَ ف س ا ن چ ہ‘ ہیں۔ بڑے سے بڑا افسانچہ سات جملوں کا ہوسکتا ہے۔ بات دل کو لگتی ہے۔ افسانچہ سات لائنوں سے زیادہ اچھا نہیں لگتا۔ میرا ماننا ہے کہ افسانچہ تین جملوں تک محدود ہونا چاہیے۔ استاد منٹو نے منی کہانی کے سائز کو بھی ’’سیاہ حاشیے‘‘ میں شامل کیا ہے۔ وہ اس وقت کی بات تھی، بہر حال افسانچے کا سائز چھوٹا ہو تو بہتر۔ افسانچے میں منظر نگاری، جزئیات نگاری اور شاعرانہ لفاظی کی گنجائش نہیں ہوتی، نہ ہی چھوٹی سی اور نازک صنف زیادہ الفاظ کا بوجھ برداشت کر سکتی ہے۔ بس ٹو دی پوائنٹ بات کیجیے اور ایک طرف ہو جایئے۔

ایک کامیاب افسانہ نگار ہی بہتر افسانچہ تخلیق کر سکتا ہے کیونکہ کامیاب افسانہ نگار افسانے کے تمام رموز و اسرار سے واقف ہوتا ہے۔ سعادت حسن منٹو بے حد کامیاب اور اپنے عہد کا مقبول افسانہ نگار تھا۔ جو ادیب اچھا افسانہ تخلیق نہیں کر سکتا، جو افسانے کی تکنیک اور لوازمات ناواقف ہو وہ اچھا افسانچہ کیسے تخلیق کر سکتا ہے!!! حقیقت یہ ہے کہ افسانہ نگاری سے زیادہ افسانچہ نگاری مشکل کام ہے۔

عصری ادب کا بوجھ اور ذمے داریاں ہمارے کندھوں پر ہیں۔ ہمیں اگر افسانچوں سے شغف ہے، ہم دل سے چاہتے ہیں کہ افسانچے کو فروغ ملے تو سب سے پہلے ہمیں اپنی اصلاح کرنی ہوگی۔ کامیاب افسانچے اردو ادب کو دینے ہوں گے۔ یہ صنف مقبول ہوئی تو آپ کے ہم عصر بھی آپ سے کندھا ملا کر کھڑے ہوں گے۔ ان شاء اللہ!۔

اردو افسانچے کے مسائل

ڈاکٹر عظیم راہی

اردو میں افسانچہ کی روایت مستحکم رہی ہے جو اپنی ابتدا سے لے کر آج تک ارتقائی سفر کے ساتھ مسلسل جاری و ساری اور مربوط ہے لیکن ادھر کچھ عرصے سے ایک بار پھر اسے لکھنے والوں نے سہل سمجھ لیا ہے حالاں کہ یہ سب جانتے ہیں کہ افسانچہ کا فن مشکل اور وقت طلب ہے جو کڑی محنت اور مسلسل ریاضت چاہتا ہے۔ یہ گہرے مطالعے کا متقاضی ہوتا ہے۔ وہیں یہ بات بھی ثابت ہو چکی ہے کہ جو افسانہ لکھ سکتا ہے وہی افسانچہ لکھ سکتا ہے۔ افسانچہ اچھا یا برا ہے اس کا فیصلہ لکھنے والے کے حق میں وقت طے کرے گا وہ ادب میں بہر حال اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے سبب ہی زندہ رہ سکتا ہے۔ وقت سب سے بڑا ناقد بھی ہے۔ یہ فیصلہ ہم وقت پر چھوڑتے ہیں لیکن یہ بات طے ہے کہ افسانہ نگاری افسانچہ نگار بن سکتا ہے۔ افسانہ کے ساتھ اچھا افسانچہ لکھ سکتا ہے جو اس کے فنی لوازمات پر پوری دسترس رکھتا ہے۔ اس بات سے محمد بشیر مالیرکوٹلوی بھی اتفاق کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''افسانچہ وہی ادیب تخلیق کر سکتا ہے جو افسانے کے رموز سے اچھی طرح واقف ہو۔ عصری تقاضوں کو سمجھ سکتا ہو اور اپنے دور کے قاری کے مزاج کو بھی سمجھتا ہو۔'' (افسانچے کی تعریف اور کامیاب افسانچے کی خوبیاں۔ مطبوعہ ایوان اردو۔ مئی 2013۔ ص:14)

اس بنیادی کمی کے باعث، افسانچہ نگار جو صرف اسی صنف میں طبع آزمائی کرتا ہے اپنی ناواقفیت، اپنی ناتجربہ کاری کے سبب اپنے افسانچہ کو اخباری خبر کا حصہ بنا دیتا ہے تو کبھی کسی قول کی نقل کو کوئی افسانچہ سمجھ بیٹھتا ہے تو کبھی اسے لطیفہ سے قریب کر کے اس کی صنفی حیثیت کو ہی مشکوک بنا دیتا ہے۔ بقول سلیم شہزاد:

''لطیفہ صوفیا کے لطائف کی لطافت سے تعلق رکھنے کے باوجود/ باوصف فنی اور ادبی مظہر نہیں، اس لیے افسانچہ کو لطیفہ بننے سے بہر حال بچایا جانا چاہیے کہ افسانچہ ادب کی صنف سے ہم رشتہ ہونے کے سبب اپنے آپ میں ایک صنفی مظہر ہونے کی اہلیت رکھتا ہے۔'' (بیانیے کے تاثر کی تصویر۔ عارف خورشید نمبر۔ ص:202 عالمگیر ادب، کتابی سلسلہ)

اس صورت حال کا ایک منظر سینئر افسانہ نگار سلام بن رزاق کے لفظوں میں دیکھیے:

''آج کل جو لوگ افسانچے لکھ رہے ہیں اس میں بیشتر سہل پسندی کا شکار ہیں۔ اکثر افسانچہ نگار کسی لطیفے، قول یا فقرے کو افسانچہ بنا دیتے ہیں جس میں نہ کوئی فن کاری ہوتی ہے اور نہ دل پذیری۔ میرے نزدیک ایسے افسانچوں کی حیثیت ٹکر متوں سے زیادہ نہیں ہے۔'' (مطبوعہ ماہنامہ تریاق۔ ستمبر 2011۔ ص:37)

شاید اسی لیے ممتاز افسانہ نگار و افسانچہ نگار محمد بشیر مالیر کوٹلوی یہ کہنے میں حق بجانب لگتے ہیں:

''میرا اندازہ ہے جو غلط ثابت بھی ہوسکتا ہے کہ ادبی تاریخ میں یہ دور افسانچوں کے زوال کا دور کہلائے گا کیوں کہ ہر ایرا غیرا افسانچہ لکھنے لگا ہے۔ لوگ افسانچے بناتے ہیں۔ کثیر تعداد، ہزاروں کی تعداد میں جس کی وجہ سے افسانچے کا معیار گر چکا ہے، بے معنی پھیکے اور کمزور

افسانچے۔آج کل مقبول افسانہ گار افسانچوں سے پرہیز کرنے لگے ہیں"۔(شعور کی رو کا افسانہ نگار۔ عارف خورشید نمبر۔ص: 149 عالمگیر ادب، کتابی سلسلہ)

دراصل یہ صورت حال افسانچہ کے فن سے ناواقفیت کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے جب کہ افسانچہ ایک مکمل کہانی پن کے ساتھ قاری کو جھنجھوڑنے والی کیفیت چاہتا ہے۔اختصار اس کی پہچان ہے۔موضوع کا اچھوتا پن اور ڈرامائی صورت حال، اختتام پر پڑھنے والے کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔اس سلسلے میں جوگندر پال کی رائے بڑی اہم ہے۔"افسانچوں کے اختصار کو تاثر کی طویل ترین کیفیت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔" (آتشیں لمحوں میں۔ عارف خورشید۔پیش لفظ جوگندر پال۔ص:7)

یعنی بقول جوگندر پال، جہاں افسانچہ بظاہر ختم ہوتا ہے وہیں سے وہ قاری کے ذہن میں شروع ہو جاتا ہے اس لحاظ سے افسانچہ مختصر ترین لفظوں میں اپنے اندر ایک طویل کہانی رکھتا ہے جو ختم ہونے پر بھی پڑھنے والے کے دماغ میں مسلسل جاری رہتا ہے اور اس طرح تادیر اس کا تاثر بنا رہتا ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب اس میں کہانی پن ہو۔

بقول نسیم محمد جان: "کہانی پن افسانچہ کی روح ہے۔" (ص:12۔ پل دو پل)

افسانچہ کی اس خوبی کی بنا پر عارف خورشید نے اسے اپنی ابتدا سے پہلے اور اختتام کے بعد جاری رہنے والا افسانہ کہا ہے۔(وقت کے پاک پر۔ص:117)

اس خصوص میں چند افسانچے دیکھیے:

"میں ان دنوں کئی بار اپنے راکٹ میں بیٹھ کر چاند تک ہو آیا ہوں۔لیکن ایک مدت ہوگئی، دس قدم چل کر اپنے بھائی سے ملنے نہیں گیا۔" (فاصلہ۔سلوٹیں۔جوگندر پال۔ص:68)

"جب سے دشمنوں کی پہچان ہوئی ہے، دوستوں سے محروم ہوگیا

ہوں۔'' (ص:17۔محرومی۔پہلا پتھر، طالب زیدی)

''وہ خود اپنے ہاتھوں کی چوڑیاں کیوں توڑ رہی ہے؟! کلائی دبا کر چوڑیاں توڑنے والا ہاتھ باقی نہیں رہا۔'' (آتشیں لمحوں میں۔چوڑیاں والا ہاتھ۔عارف خورشید،ص19)

وہ شخص جس نے میرے قتل کی سازش رچی تھی، معجزاتی طور پر میرے بچ جانے پر مبارکباد دینے والوں میں وہی سب سے آگے تھا۔'' (چلن۔درد کے درمیاں۔عظیم راہی۔ص:20)

''ان لالچیوں نے زیبا کو اپنے والدین سے صوفہ، فریج، وی سی آر کے علاوہ موٹر سائیکل بھی لانے کو کہا تھا اور جب زیبا کے والدین یہ سب نہ دے سکے تو زیبا نے ان کے عوض اپنی جان دے دی۔'' (نعم البدل۔موم کی گڑیا۔ساحر کلیم۔ص:25)

ان افسانچوں کے اختتام پر ایک مکمل کہانی قاری کے ذہن میں شروع کرنے میں افسانچہ نگار یہاں پوری طرح کامیاب نظر آتے ہیں۔جوگندر پال کے لفظوں میں مندرجہ بالا مختصر ترین کہانیاں، ''اسی طرح ہمارے تلازموں سے جڑ کر ذہن میں اتنی طویل ہوتی جاتی ہے جتنی عمر بھر کی واردات، یہی افسانچے کی تکنیک بھی ہے اور اس کا اسلوب بھی۔''

رہی بات لطیف انداز کی یہ تو اس کے حق میں سم قاتل ہوتا ہے۔ طنز کی شدید نشتریت ہی اس کا مدعا ہے۔یہی وجہ ہے کہ آج افسانچے کی صنفی حیثیت پر حرف آنے لگا ہے۔اس سقم کے سبب اکثر ناقدین تیر ہدف بناتے ہیں اور سینئر ممتاز افسانہ نگاروں نے اسے منہ نہیں لگایا۔ان کا ردِ عمل بھی بجا ہے لیکن کمزور افسانچہ نگار اپنی بات پر اڑے ہیں۔ایسے افسانچوں کی بہتات کی ایک وجہ رسائل کے مدیران بھی ہیں جو بغیر کسی چھان پھٹک کے، افسانچے کے

معیار اور مزاج کی جانچ پڑتال کیے بغیر اسے چھاپتے رہتے ہیں جب کہ اس کی اشاعت میں کڑے انتخاب کی ضرورت ہوتی ہے۔ حالاں کہ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ افسانچے کو قبول عام بنانے میں رسائل کے مدیران نے اہم رول ادا کیا ہے لیکن اسے مسلسل اس طرح چھاپ کر افراط وتفریط کا ماحول بھی پیدا کر دیا ہے کیا اس بات سے انکار ممکن ہے؟

اس پس منظر میں سلیم شہزاد کا یہ کہنا کیا غلط ہے کہ: ''کچھ رسالوں اور اخباروں کے پیشہ ور مدیروں نے آگے بڑھ کر افسانچہ کو مقبولیت دینے کا بیڑا اٹھایا۔''

اور سلام بن رزاق کے لفظوں میں: ''دوسرے لوگ لوگ جیسے تیسے سے جو بھی افسانچے لکھ کر لاتے ہیں انہیں رسالے میں چھاپ دیتے ہیں۔ انھیں اپنا پیٹ بھرنے کے لیے اس سے بھی اتفاق کرنا پڑتا ہے۔''

لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ چند پرچوں نے افسانچوں کی اشاعت میں غیر معمولی دلچسپی لے کر اسے خوب پروان چڑھایا ہے۔ اس خصوص میں 'شاعر' کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ مدیر 'شاعر' نے تو افسانچہ کو نئی زندگی عطا کی ہے۔ مسلسل اس کی پیش رفت اور قبولیت میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ 'شاعر' نے افسانچہ پر کئی اہم چھوٹے بڑے گوشوں کا اہتمام بھی کیا ہے۔ اس طرح افسانچہ کو پوری ادبی دنیا میں اور غیر مما لک میں آبادی اردو کی نئی بستیوں میں بھی متعارف کروایا ہے۔

شاعر کی طرح دیگر ادبی رسائل جیسے 'کوہسار جنرل'، 'زاویہ' (سویڈن) 'انشا'، 'ادبی محاذ'، 'قرطاس'، 'اسباق' اور 'بیباک' وغیرہ نے بھی افسانچوں کی اشاعت میں غیر معمولی دل چسپی لے کر اس صنف کو قبول عام بنانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ کئی افسانچہ نگاروں کے گوشے بھی شائع کیے ہیں لیکن 'شاعر' جیسا رسالہ جس نے اس کی ترویج و اشاعت میں مرکزی کردار ادا کیا ہے اب افسانچوں کی اشاعت سے گریز کرنے لگا ہے اور افسانچوں کے نام پر ادھر مزید تجربوں کی طرف توجہ دینا شروع کر دی ہے۔ مدیر 'گلبن' نے پہلے سے ہی اس کی اشاعت پر قدغن لگا رکھی ہے۔ دراصل افسانچوں کی بہتات نے بھی اس کے معیار پر

سوالیہ نشان لگا دیا ہے۔'آج کل' اور'ایوان اردو' اپنی ابتدا سے عائد پابندی کا اہتمام کرنے لگے ہیں۔اس اہم امر پرغور وفکر کرنا وقت کی ضرورت ہے۔

اس صورت حال کے باوجود کچھ نئے لوگ صرف افسانچے لکھ رہے ہیں اور اپنی دانست میں سمجھ بیٹھے ہیں کہ ادب میں اس کی بنیاد پر اپنا نام بنالیں گے۔اس خام خیال کی طرف نورالحسنین، احمد صغیر ودیگر ہم عصر افسانہ نگاروں نے بارہا توجہ دلائی ہے اور اپنی طرح نہ صرف افسانہ بلکہ ناول لکھنے کی ترغیب دلا رہے ہیں لیکن ہنوز دلی دور است، کے مصداق یہ لوگ ابھی تک وہیں کھڑے ہیں۔ پکی سیاہی میں نام چھپوانے کی ہوڑ میں کچھ نئے لکھنے والے افسانچے کے نام پر کبھی لطیفے لکھتے ہیں تو کبھی اقوال۔اور نشاندہی کرنے پر یوں چراغ پا ہوجاتے ہیں کہ بوکھلاہٹ میں لایعنی بکنے لگتے ہیں جب کہ بشیر مالیرکوٹلوی کے مشورہ کے مطابق: ''نئے افسانچہ نگاروں کو تنقید کا برا نہیں ماننا چاہیے کہ اس سے ان کے فن پر نکھار آتا ہے۔بہتر لکھنے کی تحریک ملتی ہے۔'' خیر نئی نسل کو تو سمجھایا جاسکتا ہے لیکن اب اس ستم کو کیا کہا جائے کہ طنز ومزاح کے میدان کے کچھ کھلاڑی بھی افسانچے کی سرحد میں داخل ہوگئے ہیں جو افسانچہ کی فضا کو مسموم کررہے ہیں اور اس کی صنفی ساکھ کو مزید متاثر کرنے پر تلے ہیں۔ اس سارے ماحول کو دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے ہر کوئی افسانچہ پر ہاتھ صاف کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اب اس صورتحال کا کچھ نہ کچھ سدباب لازمی ہوگیا ہے۔

ایسی صورت میں ادھر یہ بحث بھی چھیڑ دی گئی ہے کہ افسانچہ کتنی سطروں پر مشتمل ہونا چاہیے۔کچھ لوگ سہ سطری کی بات کرتے ہیں تو کچھ سات سطروں کی لیکن یہ پیمانہ بھی اچھے افسانچے کی تخلیق کے لیے کارآمد ثابت نہیں ہوسکتا ہے کہ افسانچے کی جامع تعریف کے مطابق مختصر ترین لفظوں اور کم سے کم سطروں میں ایک مکمل کہانی بیان کرنے پر تخلیق کار کو قدرت حاصل ہونی چاہیے۔اس مہارت پر بھی اچھے افسانچے کی تخلیق کا انحصار ہے جو اس کی سب سے بڑی شرط ہے اور یہ شرط پوری نہ ہونے کی صورت میں آج کل افسانچے کے حصے میں مقبولیت کم اور مخالف زیادہ ہاتھ آرہی ہے اور اس کے اچھے لکھنے والوں کا بھی نام خراب

ہونے لگا ہے، وہ بھی اس کی زد پر ہیں۔اس صورت حال پر غور وفکر کی سخت ضرورت ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس سخت آزمائش کے ماحول میں ایک اچھی پیش رفت ان دنوں یہ ہوئی ہے کہ چند سینئر افسانہ نگاروں نے بھی افسانچے لکھنے کی شروعات کی ہے اگر چہ کہ یہ لوگ باقاعدہ اس کی مخالفت میں نہیں تھے مگر پوری طرح موافقت میں بھی نہ تھے۔ اس طرف ان کی توجہ ایک خوش آئند عمل ہے۔

ان لکھنے والوں میں نور شاہ، دیپک بدکی، ف۔س۔اعجاز اور محترمہ بانو سرتاج کے نام اہم ہیں۔اس کے ساتھ ہی کچھ ایسے ناقدین کے رویے میں بھی لچک پیدا ہوئی ہے جو سرے سے اس کے مخالف تھے۔ وہ بھی اس کی مقبولیت سے متاثر ہوئے ہیں۔لیکن افسانچہ کی مقبولیت کے وقار کو برقرار رکھنا بھی لازمی امر ہے جوان معنوں میں آج کل ایک بڑا مشکل کام ہے کہ افسانچے کی صنفی سطح پر مستحکم ہونے کی راہ میں کئی رکاوٹیں بھی پیدا کر دی گئی ہیں کہ اس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے ہراساں، اکثر پر خود ساختہ موجد بننے کا بھوت سوار ہو گیا ہے۔اس چکر میں عبدالعزیز خان افسانچے کے نام پر ایک عرصے سے یک سطری کہانی لکھ رہے ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ اچھی بات ہے کہ کل مزید ترقی یافتہ دور میں لوگ 'یک لفظی' کہانی لکھنے کا جواز پیدا کر لیں گے۔ یک سطری کے ساتھ منی افسانہ، منی کہانی کے دم چھلے بھی افسانچے کے ساتھ اس کے لکھنے والوں نے لگا رکھے ہیں حالانکہ جوگندر پال نے افسانچے کا نام بہت پہلے ہی دے رکھا ہے۔(1962 میں ان کے افسانوی مجموعہ ''میں کیوں سوچوں'' میں 32 افسانچے اسی نام سے شامل ہیں۔سب سے پہلے افسانچہ کا نام جوگندر پال نے ہی استعمال کیا ہے)ادھر مقصود الٰہی شیخ، 'پاپ کہانی' کے نام سے افسانچہ کی صنفی حیثیت کو مشکوک بنانے پر تلے ہیں اور افسانچہ کو بدنام کرنے کا پاپ بھی ادب میں کر رہے ہیں تو اسی طرح مناظر عاشق ہرگانوی نے 'کٹ اپ' تکنیک افسانے لکھنے کی شروعات کر کے ایک نیا شوشہ چھوڑ دیا ہے اور اسے محمد بشیر مالیر کوٹلوی نے بجا طور پر افسانچہ پر 'تیسرا حملہ' قرار دیا ہے۔مگر اب اسے کیا کہا جائے کہ افسانچوں پر اس طرح کے حملوں کا

سلسلہ مسلسل جاری ہے۔ چند لوگ ’آتش پارے‘ کے نام سے افسانچے لکھ رہے ہیں تو فاروق راہب نے ’راک کہانی‘ کا آغاز کیا ہے۔ ہوسکتا ہے کل ان کی دیکھا دیکھی کوئی ’کنٹوپ کہانی‘ لکھنا شروع کردے گا۔ ادب میں آخر اس لایعنی سلسلے کا کیا جواز ہوسکتا ہے؟

کڑی محنت اور بڑی مشکل سے تسلیم شدہ اس مقبول عام مصنف کو نئے نام دے کر منزل کی سمت گامزن راستوں پر مزید پیچیدگی پیدا کر کے، محض اپنا نام زیادہ نمایاں کرنے کی کوششوں سے بھلا کیا حاصل ہوگا؟ یہ میری سمجھ سے باہر ہے۔ ان تخلیق کاروں کے ساتھ، ادھر تجربہ پسند مدیر الگ ان چیزوں کو سراہتے ہوئے اس سلسلہ کو مزید ہوا دے رہے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ادب میں تجربے لازمی ہی نہیں بلکہ ناگزیر ہیں جو زندگی سے عبارت ہوتے ہیں لیکن جب افسانچہ کا تجربہ اپنی اہمیت کو منوا کر صنفی شکل میں کامیاب ہو چکا ہے تو پھر اسے مزید نئے تجربوں سے گزارنا یقیناً اس کی صنفی حیثیت کو مشکوک بنا کر اس پر شب خون مارنے کے ہی مترادف ہوگا۔ اس سارے منظرنامے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ افسانچہ تو بے حد مقبول ہو رہا ہے اور زیر بحث بھی ہے لیکن یہ اعداد و شمار افسانچے کی مقبولیت و قبولیت کے ساتھ اس کی بدنامی اور معتوب ہونے کا جواز بن کر بھی ابھرتے ہیں جو ہمیں غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں اور بطور خاص نئے لکھنے والوں کے لیے تو لمحۂ فکریہ ہے کہ اکیسویں صدی میں اپنی اس پنپتی صنف کو مقبول بنانے کے ساتھ ساتھ، اس کی صنفی ساکھ کو بچانے کی بھی شدید ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

اردو میں افسانچہ نگاری

پروفیسر اسلم جمشید پوری

تغیر، ہمیشہ ہر عہد میں وقوع پذیر ہوتا رہتا ہے۔تغیر نئے جہان معنی کی تعمیر کرتا ہے،تغیر ہمیشہ آگے بڑھتے رہنے کے لیے حوصلہ اور ہمت عطا کرتا ہے۔اسی تغیر کی بنا پر تحریکات و انقلاباب رونما ہوتے رہتے ہیں۔ادب میں بھی تغیر کے شانے پر نت نئےShades آتے جاتے رہتے ہیں۔ایک زمانہ تھا جب طویل داستانیں عوام وخواص میں مقبول تھیں۔ ہفتوں اور مہینوں ایک ہی داستان اپنے مختلف رنگوں، تحیر و تجسس، داستان گو کے انداز اور لہجے کے اتار چڑھاؤ کے دم پر اپنے سامعین کو باندھے رکھنے میں کامیاب رہتی تھی۔قتل کی سزائیں بھی، داستانوں کے زیر اثر تبدیل ہوجایا کرتی تھیں۔وقت نے کروٹ بدلی۔صنعتی انقلاب نے لوگوں کی زندگی بدل کر رکھ دی۔اب لوگوں کو کام ملنے لگا۔فرصت کے لمحات اپنا بدن سمیٹنے لگے۔طویل داستانوں کی جگہ قصوں اور حکایتوں نے لے لی۔کم وقت میں ختم ہونے والے قصے عوامی پسند بن گئے۔ایک بار پھر وقت نے پلٹا کھایا۔انسان کی مصروفیت میں مزید اضافہ ہوتا گیا۔19 ویں صدی کے نصف اول کے بعد ناول سامنے آیا۔ناول کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔داستان کی مقبولیت میں بتدریج کمی واقع ہوتی گئی۔ناول نے زندگی کے حقائق کو کچھ اس طور پیش کرنا شروع کیا کہ آہستہ آہستہ عوامی پسند بنتا گیا۔

ابھی ناول مقبولیت کے آسمان سر کر ہی رہا تھا کہ افسانہ کا بھی وجود سامنے آ گیا۔ افسانے نے مقبولیت کے نئے آسمان سر کیے۔ناول بھی بتدریج عروج پذیر ہوتا رہا۔

افسانے کا گراف بھی مسلسل بلند ہوتا رہا۔ اسی دوران افسانچے نے بھی ادب میں قدم رکھا۔ ابتدا میں افسانچے کو خاطر خواہ پذیرائی نہیں ملی۔ لیکن آزادی کے بعد افسانچے نے اپنے قدم جمانے میں کامیابی حاصل کرلی۔

بعض حضرات کا ماننا ہے کہ اردو میں افسانچے، مغرب کے او۔ ہنری اور خلیل جبران کی تقلید میں سامنے آئے۔ میرا خیال ہے ایسا کہنا غلط ہوگا کیوں کہ مغرب میں تو نہ جانے کیا کیا، کس کس طور لکھا جاتا ہے۔ 55 فکشن، سو الفاظ پر مشتمل drabble فلیش فکشن، مائکروفکشن اور تازہ بہ تازہ پوپ کہانی، وغیرہ الم غلم اصناف Writing Fashion کے طور پر رائج ہیں۔ ان میں سے کتنی، ہندوستانی ادب خصوصاً اردو نے قبول کیں۔

اگر منٹو نے او۔ ہنری یا خلیل جبران کی نقل یا تقلید میں ''سیاہ حاشیے''، قلم بند کیے تھے، تو منٹو کو علم ہوتا کہ وہ ایک نئی صنف اردو میں متعارف کرا رہے ہیں اور ایسا کرتے وقت منٹو اس صنف کے موضوعات، ہیئت، اجزائے ترکیبی وغیرہ کا بھی لحاظ رکھتے لیکن ایسا کچھ بھی ''سیاہ حاشیے'' میں نظر نہیں آتا جو دانستہ طور پر تحریر کیا گیا ہو۔

افسانچہ لفظ اردو میں کب استعمال ہوا اور کس کے ذریعہ ہوا؟ یہ ایک تحقیق طلب امر ہے۔ یہ بات تو تسلیم شدہ ہے کہ افسانچہ اردو میں سعادت حسن منٹو کے ''سیاہ حاشیے'' سے شروع ہوا۔ ''سیاہ حاشیے'' کی اشاعت اول اکتوبر 1948 میں عمل میں آئی۔ اس عہد میں اردو میں لفظ افسانچہ رائج نہیں تھا۔ یہی سبب ہے کہ پروفیسر محمد حسن عسکری نے منٹو کے ''سیاہ حاشیے'' کو افسانے ہی کہا ہے، ہاں کہیں کہیں وہ انھیں لطیفے بھی کہہ گئے ہیں جو ''سیاہ حاشیے'' اور سعادت حسن منٹو دونوں کے ساتھ ناانصافی ہے۔ میں نے لفظ افسانچے کے سب سے پہلے استعمال کی تحقیق شروع کی تو کوئی خاص نتیجہ نہیں ملا۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ افسانچے سے قبل ان کے لیے استعمال ہونے والے متعدد الفاظ منی کہانی، مختصر ترین افسانہ، مختصر مختصر کہانی، منی افسانہ، سامنے آئے۔ افسانچہ کے تعلق سے موجودہ عہد کے افسانچہ نگاروں اور ناقدوں

میں بشیر مالیر کوٹلوی، عظیم راہی، ایم اے حق، مناظر عاشق ہر گانوی سے گفتگو کی۔ رسائل کے پرانے شمارے دیکھے۔ کتب خانوں کی خاک چھانی۔ اس سلسلے میں عظیم راہی نے بتایا کہ ان کی جوگندر پال سے 1981 میں گفتگو ہوئی تھی۔ لفظ افسانچہ ان ہی کا دیا ہوا ہے۔ مناظر عاشق ہر گانوی نے مدلل تصدیق کرتے ہوئے کہا کہ انھیں جوگندر پال نے کسی انٹرویو میں بتایا تھا کہ انھوں نے 1962 میں افسانچہ کا استعمال کیا۔ اس کی تصدیق رتن سنگھ نے بھی کی بلکہ رتن سنگھ نے اس سلسلے میں اپنی رائے قدرے مختلف بیان کی۔ انھوں نے مجھے ٹیلیفون پر بتایا کہ وہ اصناف کی تقسیم اختصار یا طوالت کے اعتبار سے نہیں مانتے۔ یہی سبب ہے کہ وہ طویل افسانہ، طویل مختصر افسانہ، مختصر افسانہ، منی کہانی، مختصر مختصر افسانہ، افسانچہ وغیرہ کو تسلیم نہیں کرتے۔ کہانی کو صرف کہانی ہونا چاہیے، وہ Piece of Art ہو بس۔ خواہ وہ طویل ہو یا مختصر، دو سطر کی ہو یا سو سطروں پر مشتمل۔ جوگندر پال بھی کچھ اسی قسم کے خیالات رکھتے ہیں:

> ''تحریر ذی جان ہونے کا انحصار دراصل اس امر پر ہوتا ہے کہ اس کے وجود سے ہی اس کی ذات کا ادراک ہو جائے۔ ہمارا وجود بڑا یا چھوٹا، اسی لیے ہمیں بوجھ معلوم نہیں ہوتا کہ اس کے سارے اجزاء داخلی اور مقامی ہونے کے باعث عین متناسب ہو تے ہیں۔ کہانی اگر اپنے اصل تناسب سے باہر نہ ہو تو ایک سطری ہو کر بھی پوری کی پوری ہوتی ہے ورنہ اپنی تمام تر طوالت کے باوصف ادھوری کی ادھوری'' (کتھانگر، جوگندر پال۔ ص: نمبر 5۔1986)

افسانچے کی طوالت، اختصار یا اس کی تعریف کے تعلق سے ڈاکٹر عظیم راہی اپنی تحقیقی کتاب ''اردو میں افسانچہ کی روایت: تنقیدی مطالعہ'' میں لکھتے ہیں:

> ''افسانچہ ادب کی وہ نثری صنف ہے جس میں کم سے کم لفظوں میں کم

> سے کم سطروں میں ایک طویل کہانی کو مکمل کر لیں چوں کہ ناول، افسانہ اور افسانچہ کا فرق پہلے ہی اس طرح بتایا گیا ہے کہ ناول پوری زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔ جب کہ افسانہ زندگی کے صرف ایک پہلو پر روشنی ڈالتا ہے اور افسانچہ زندگی کے کسی چھوٹے سے لمحے کی تصویر دکھا کر ایک مکمل کہانی قاری کے ذہن میں شروع کر دینے کا نام ہے۔'' (اردو میں افسانچہ کی روایت: تنقیدی مطالعہ، ڈاکٹر عظیم راہی، ص۵۹، ۲۰۰۹ء)

ڈاکٹر عظیم راہی، خود بھی افسانہ اور افسانچہ نگار ہیں۔ لہٰذا وہ افسانچہ نگاری کے رموز سے واقف ہیں۔ انھوں نے ناول، افسانہ اور افسانچہ کے مابین فرق کو مثالوں سے عمدگی کے ساتھ واضح کیا ہے۔ لیکن افسانچے کے تعلق سے بہت زیادہ اختلافات ہیں۔ خاص کر افسانچے کی ہیئت کو لے کر آج تک کوئی قابل قبول رائے نہیں ملتی۔ معروف افسانہ نگار اور کہنہ مشق افسانچہ نگار محمد بشیر مالیر کوٹلوی نے اِدھر فن افسانہ اور فنِ افسانچہ نگاری پر خاص توجہ صرف کی ہے۔ انھوں نے اس تعلق سے کئی مضامین قلم بند کیے ہیں۔ خود اپنے افسانچوں کے مجموعے ''جگنو شہر'' کے پیش لفظ ''حسب حال'' میں انھوں نے افسانچہ کے معیار اور ہیئت پر خاصا زور دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ایک کامیاب افسانچہ میں اسے ہی مانتا ہوں جسے پڑھ کر محسوس ہو کہ اس افسانچہ کو بنیاد بنا کر ایک طویل افسانہ بھی تخلیق کیا جا سکتا تھا۔ دو جملوں کا افسانچہ میرے نزدیک طویل افسانے کا نعم البدل نہیں ہو سکتا۔ قاری کی تشنگی نہیں مٹا سکتا۔ افسانچہ کا موضوع بھر پور چاہتا ہے۔'' (جگنو شہر۔ محمد بشیر مالیر کوٹلوی۔ ص:15۔ 2011)

محمد بشیر مالیر کوٹلوی کی بات میں دم ہے کہ افسانچے کو اتنا اور ایسا ہونا چاہیے، جس سے

قاری کی تشنگی دور ہو سکے۔ وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ یہ کام دو جملوں کے افسانچے نہیں کر سکتے۔ افسانچہ کھیل تماشا نہیں ہے اور نہ ہی لطیفہ بازی بلکہ افسانچہ کا موضوع بھرپور مواد کا تقاضا کرتا ہے۔ وہ افسانچے کے خدوخال اور ہیئت کے تعلق سے دوٹوک لکھتے ہیں:

> ''دراصل افسانچہ پانچ سے دس سطروں کا ہی (افسانے) کا مقصد پورا کرتا ہے۔ میرے نزدیک دوسطری، سہ سطری افسانچے افسانچے نہیں ہوتے، دوسطری افسانچے، افسانے کا نعم البدل نہیں بن سکتے۔ سیاہ حاشیے میں دیکھئے دوسطری زیادہ سے زیادہ دس فیصد ہوں گے لیکن یار لوگوں نے افسانچے کو ایک سطری بنا کر ایک نئی صنف کی بنیاد ڈال دی اور خالق تاریخ ساز بن گئے۔'' (جگنو شہر۔ محمد بشیر مالیر کوٹلوی۔ ص:14۔ 2011)

بشیر مالیر کوٹلوی ممتاز افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے افسانچے کو خون جگر سے سینچا ہے۔ وہ افسانے اور افسانچے کی باریکیوں سے بھی کما حقہ واقف ہیں۔ ان کی نظر فنی لوازم پر بڑی سخت ہوتی ہے۔ وہ افسانوں پر تبصرہ بھی بے لاگ کرتے ہیں۔ انھیں فی زمانہ افسانچے کے ساتھ ہونے والے مذاق سے بہت تکلیف ہے۔ آج ہرا یرا غیرا افسانچے میں طبع آزمائی کر رہا ہے۔ نہ معیار، نہ زبان، نہ کہانی پن...بھونڈا پن، بے جا اختصار، تجربہ برائے تجربہ...ادھر افسانچوں کے مجموعے کی باڑھ سی آ گئی ہے۔ ہر مجموعے میں 100 یا اس کے آس پاس افسانچے موجود ہیں اور یہ زیادہ تر ایک یا دو نشستوں میں تحریر کیے گئے ہیں۔ ایسے افسانچوں سے آج افسانچے کے وجود کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ میں ان سے اتفاق کرتا ہوں کہ افسانچوں کا معیار روز بروز گر رہا ہے۔ افسانچے کی ہیئت کا جہاں تک سوال ہے تو یہ بات قابل توجہ ہے کہ تقریباً 75 سال کے طویل وقفے کے بعد بھی، آج تک افسانچہ، صنف کا درجہ حاصل نہیں کر پایا۔ کیوں؟ کیوں کہ ایک تو ابتدا سے تقریباً 30۔25 برسوں تک اسے مختلف ناموں سے ہی پکارا جاتا رہا۔ افسانچہ نام ساٹھ کے دہے میں دیا گیا۔ اس کے بعد بھی

کافی زمانے تک افسانچہ، منی افسانہ، مختصر مختصر افسانہ، منی کہانی...سارے نام متوازی طور پر چلتے رہے۔ دوسرے اس کی ہیئت کبھی متعین نہ ہوسکی۔ ویسے نثری فن پاروں کی ہیئت کبھی متعین نہیں رہی۔ کیا داستانوں کی طوالت کی کوئی حد مقرر ہے؟ ناولوں کی صفحات کی تعداد متعین ہے۔ طویل افسانہ، طویل مختصر افسانہ یا افسانہ کے صفحات یا سطریں مقرر ہیں؟ جب ایسا نہیں ہے تو پھر افسانچے کو صفحات اور سطروں میں قید کرنا کیا اس صنف کے ساتھ ناانصافی نہیں ہے۔ مغرب میں افسانچوں یا نثری فن پاروں کو ایسی قیود میں قید کیا گیا لیکن ان کے خاطر خواہ نتائج کب سامنے آئے۔ وہاں 55 فکشن (یعنی ۵۵ لفظوں کا فن پارہ) drabble یعنی سو الفاظ پر مشتمل فن پارہ، فلیش فکشن (یعنی سگریٹ کے راکھ ہونے کے ساتھ ختم ہونے والا فکشن) وغیرہ کے تجربے ہوئے لیکن کتنے کامیاب ہوئے؟ پھر افسانچے کے ساتھ ہی ایسا کیوں؟ افسانچے کے چند معروف مصنفین کے افسانچوں پر ایک نظر ڈالیں۔ سعادت حسن منٹو کے سیاہ حاشیے میں ایک سطر، دو سطر، تین، چار پانچ سطروں سے 68 سطروں اور چار پانچ صفحات پر مشتمل افسانچے ملتے ہیں۔

جوگندر پال کے افسانچوں کے مجموعے ''کتھا نگر'' میں ایک، دو، تین، پانچ سطروں سے لے کر 280 سطروں تک کے افسانچے ملتے ہیں۔ محمد بشیر مالیر کوٹلوی کے افسانوی مجموعے ''جگنو شہر'' میں چار، پانچ، چھ سطروں سے 47، 48، 49 سطروں تک کے افسانچے ملتے ہیں۔ ڈاکٹر ایم اے حق کے افسانچوں کے مجموعے ''نئی صبح'' میں تین سطروں سے لے کر 115، سطروں تک کے افسانچے ملتے ہیں۔ ان تمام مثالوں سے ایک بات واضح ہوجاتی ہے کہ افسانچے میں لفظوں، سطروں، صفحوں کی تعداد کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اصل بات کہانی پن، اختصار، تحیر، تجسس کا ہونا ہے جس سے کوئی واقعہ یا لمحہ قید ہو کر کہانی کی شکل اختیار کر لے۔ ناول ہو، افسانہ یا افسانچہ اسی وقت کامیاب ہیں جب اس میں قصہ پن موجود ہو۔ افسانچوں میں اضافی خوبی کے طور پر طنز کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔

یوں تو مغرب میں افسانچے کی شروعات بہت قبل ہو چکی تھی، لیکن ہندستان خصوصاً

اردو میں افسانچے تحریر کرنے کا سہرا سعادت حسن منٹو کے سر ہے۔ منٹو سے قبل اردو میں افسانچے کا گذر نہیں ملتا۔ منٹو نے ''سیاہ حاشیے'' کی شکل میں افسانچوں کا ایک ایسا مجموعہ اردو کو عطا کیا جو نہ صرف اپنے عہد کا غماز ہے بلکہ فن افسانچہ نگاری کی اساس بھی ہے۔ منٹو نے جس ہنر مندی اور فنی مہارت سے صنف افسانہ کو استحکام، تقویت اور سر بلندی عطا کی اسی فنی مشاطگی، بالیدہ نظر اور عصری مسائل سے آگہی کی بدولت افسانچہ جیسی صنف کی بنیاد گزاری کا مشکل امر انجام دیا۔ سعادت حسن منٹو کے مجموعے ''سیاہ حاشیے'' میں 31 افسانچے شامل ہیں جن میں دو تو 68 اور 65 سطروں یا پانچ صفحات پر مشتمل ہیں اور کئی دو، تین، چار، پانچ سطروں کے بھی ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ منٹو کے ذہن میں سیاہ حاشیے تحریر کرتے ہوئے یہ واضح نہیں تھا کہ وہ افسانچے تحریر کر رہے ہیں یا یہ بھی کہ منٹو نے افسانچے کے فن یا اس کے فنی لوازم کا کوئی پیمانہ یا معیار نہیں اپنایا تھا۔ یہی سبب ہے کہ محمد حسن عسکری نے ''سیاہ حاشیے'' کا مقدمہ ''حاشیہ آرائی'' لکھتے وقت ان کو کبھی افسانہ کہا تو کبھی لطیفہ بھی۔ محمد حسن عسکری نے اپنے 11 صفحے کے مقدمے میں کئی جگہ یوں تحریر کیا ہے:

> ''منٹو نے بھی فسادات کے متعلق کچھ لکھا ہے، یعنی یہ لطیفے یا چھوٹے چھوٹے افسانے جمع کیے ہیں...'' (سیاہ حاشیے۔ص:12)

ایک جگہ اور لکھتے ہیں:

> ''فسادات کے متعلق جتنے بھی افسانے لکھے گئے ہیں ان میں منٹو کے یہ چھوٹے لطیفے سب سے زیادہ ہولناک اور سب سے زیادہ رجائیت آمیز ہیں'' (سیاہ حاشیے۔ص:16)

محمد حسن عسکری کے ان اقتباسات سے ظاہر ہے کہ منٹو نا محمد حسن عسکری کے یہاں اور نا اس وقت کے ادبی منظر نامے میں افسانچہ لفظ استعمال ہوا تھا۔ لفظ افسانچہ یا صنف افسانچہ کے طور پر منٹو نے مجموعہ ''سیاہ حاشیے'' قلم بند نہیں کیا تھا۔ یہی سبب ہے کہ افسانچہ کے خدو خال

کا تعین منٹو کے یہاں نہیں ملتا یا یہ بھی ممکن ہے کہ منٹو کی نظر میں افسانچہ سے مراد وہ قصہ یا واقعہ ہو جسے کم سے کم سطروں میں لکھا جا سکے جس کی کوئی میعاد مقرر نہیں کی جا سکتی۔ یعنی ہر افسانچہ اپنے موضوع اور Treetm ent کے اعتبار سے اپنی طوالت یا اختصار کا متقاضی ہوگا۔ ''سیاہ حاشیے'' کے سارے افسانچوں کا مطالعہ کر جائیے آپ یہی طریقہ کار موجود پائیں گے۔ دو سطروں پر مبنی افسانچے بھی ہیں۔ مثلاً

آرام کی ضرورت

''مرا نہیں.....دیکھو ابھی جان باقی ہے،

''رہنے دو یار......میں تھک گیا ہوں۔''

اور تین سطروں کا افسانچہ

اُلہنا

''دیکھو یار، تم نے بلیک مارکیٹ

کے دام بھی لیے اور ایسا ردی

پٹرول دیا کہ ایک دکان بھی نہ جلی۔''

جسے اگر ایک سطر میں لکھ دیا جائے تو یہ آج کا یک سطری افسانہ ہی ہوگا۔ یعنی:

اُلہنا

''دیکھو یار، تم نے بلیک مارکیٹ کے دام بھی لیے اور ایسا ردی پٹرول دیا کہ ایک دکان بھی نہ جلی''

اگر منٹو کے ذہن میں یہ واضح ہوتا کہ وہ افسانچہ کی بنیاد ڈال رہے ہیں تو منٹو جیسا ذہین شخص اس طرح کے افسانچے تحریر کرتا جس سے فن افسانچہ نگاری کے نقوش نہ صرف واضح ہو جاتے بلکہ افسانچے کو صنف کا درجہ بھی جلد ہی مل جاتا۔ پھر منٹو اُلہنا کو تین سطروں میں تحریر نہ کرتا بلکہ ایک سطر میں لکھ کر یک سطری افسانے کا موجد بھی بن جاتا۔

جہاں تک ''سیاہ حاشیے'' کے موضوعات کا تعلق ہے تو یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ

منٹو نے یہ افسانے/افسانچے، تقسیم ہند کے دل دوز واقعے کے نتائج کے طور پر ملک کے طول وعرض میں پھیلے فرقہ وارانہ فسادات کو موضوع بنا کر تحریر کیے۔ ہر افسانچے میں فرقہ وارانہ کیفیت، اس کے نتائج، انسان کا حیوان بننا، شرمسار ہوتی انسانیت، درندگی، بے رحمی اور سفاکی کے مظاہرے ہیں۔ منٹو یا دیگر فکشن نگاروں میں ایک واضح فرق یہ پایا جاتا ہے کہ منٹو افسانہ قلم بند کرتے وقت جج نہیں ہوتا، وہ کسی کو ظالم، جابر، معصوم، بے گناہ، مظلوم ثابت نہیں کرتا بلکہ صرف تصویر پیش کرتا ہے اور باقی معاملہ قاری کے حوالے کر دیتا ہے۔ قاری خود فیصلہ کرتا ہے کہ کون ظالم ہے، کون مظلوم، کون ظالم ہو کر بھی رحم دل ہے اور کون رہنما ہو کر بھی رہزن۔ کون اپنے سفید کرتے کے اندر کتنا بدنما اور کالا ہے اور کون طوائف ہو کر بھی انسانیت اور محبت کے جذبے سے سرشار ہے۔ محمد حسن عسکری اپنے مقدمے میں منٹو کی اس خوبی کا بیان کرنے سے قبل فساد یا قتل و غارت گری وغیرہ پر افسانہ لکھنے والوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''یہ لوگ اس مقصد سے افسانے لکھتے ہیں کہ ظالم کا خارجی عمل دکھا کر ظلم کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا کریں۔ لیکن جب تک ہمیں کسی فعل کا انسانی پس منظر معلوم نہ ہو، محض خارجی عمل کا نظارہ ہمارے اندر کوئی دیرپا، ٹھوس اور گہری معنویت رکھنے والا ردعمل پیدا نہیں کرسکتا۔ ہم انسانوں سے تو نفرت اور محبت کر سکتے ہیں''ظالموں اور مظلوموں سے نہیں۔'' (سیاہ حاشیے۔ص:11)

محمد حسن عسکری نے اپنے اس مقدمے میں تفصیل سے خارجی اور داخلی عوامل کا ایک ادیب کی زندگی اور فن پر اثرات پر بحث کی ہے اور ایسے لکھنے والوں کی خبر بھی لی ہے جو کسی واقعے یا حادثے کی وقوع پذیر ہونے کا انتظار کرتے ہیں اور پھر اس پر شہد کی مکھی کی طرح ٹوٹ پڑتے ہیں۔ فسادات پر بھی سینکڑوں بلکہ ہزاروں ادیبوں نے افسانے قلم بند کیے۔ لیکن ان کی یہ

افسانے کیا واقعی افسانے تھے؟ یا پروپیگنڈہ یا خاص بات کا اشتہار؟ یا خود کو صاف ستھرا، سیکولر اور انسانیت کا علم بردار ثابت کرنے کا ذریعہ؟ وہ ''سیاہ حاشیے'' کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

''فسادات پر لکھنے والے افسانہ نگاروں نے ظلم سے نفرت دلانے کے لیے اکثر یہ طریقۂ کار استعمال کیا ہے کہ ظلم ہوتا ہوا دکھا کر پڑھنے والوں کے دلوں میں دہشت پیدا کی جائے مگر سارے واقعات اتنے تازہ ہیں، لوگ اپنی آنکھوں سے اتنا کچھ دیکھ چکے ہیں یا اپنے قریبی دوستوں سے اتنا سن چکے ہیں کہ محض ظلموں کی فہرست اب ان کے اوپر کوئی اثر ہی نہیں کرتی۔ اگر آپ نے اپنے افسانے میں دو چار عورتوں کی بے حرمتی یا بچوں کا قتل دکھا دیا تو اس سے لوگوں کے اعصاب پر کوئی ردعمل ہوتا ہی نہیں۔ یہ زمانہ ہی ایسا غیر معمولی ہے کہ غیر معمولی ظلم آج کل بے انتہا معمولی چیز بن گئے ہیں۔ غیر معمولی باتیں اب لوگوں کو چونکاتی نہیں۔'' (سیاہ حاشیے، ص 12۔11)

پروفیسر محمد حسن عسکری نے یہ باتیں اکتوبر 1948 میں 'سیاہ حاشیے' کے پہلے ایڈیشن کی اشاعت کے وقت تحریر کی تھیں یعنی آج سے 65 سال قبل، لیکن ان کے الفاظ سے ایسا مترشح ہو رہا ہے کہ وہ آج کے فسادات کے متعلق اور فسادات پر لکھے جانے والے ادب کے تعلق سے مضمون قلم بند کر رہے ہوں۔ ان تمام باتوں کے برعکس جب وہ فسادات کے تعلق سے منٹو کی تحریروں کا جائزہ پیش کرتے ہیں تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دیتے ہیں:

''یہ افسانے فسادات کے متعلق نہیں ہیں بلکہ انسانوں کے بارے میں، منٹو کے افسانوں میں آپ انسانوں کو مختلف شکلوں میں دیکھتے رہے ہیں۔ انسان بحیثیت طوائف کے، انسان

بحثیت تماش بین کے وغیرہ وغیرہ، ان افسانوں میں بھی آپ
انسان ہی دیکھیں گے فرق صرف اتنا ہے کہ یہاں انسان کو ظالم یا
مظلوم کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے اور فسادات کے مخصوص
حالات میں سماجی مقصد کا تو منٹو نے جھگڑا ہی نہیں پالا۔ اگر تلقین
سے آدمی سدھر جایا کرتے تو مسٹر گاندھی کی جان ہی کیوں
جاتی۔ منٹو کے افسانوں کے اثرات کے بارے میں نہ زیادہ غلط
فہمیاں ہیں نہ انھوں نے ایسی ذمے داری اپنے سر لی ہے جو ادب
پوری کر ہی نہیں سکتا۔'' (سیاہ حاشیے، ص:12)

یہاں عسکری منٹو کی ادب سے کسی وجہ سے وابستگی کی تردید کرتے ہوئے یہ ثابت
کرتے ہیں کہ وہ خالصتاً ادب تحریر کرنے پر زور دیتے تھے جب کہ ان کے اکثر معاصرین
افسانے، ناول یا دوسرے ادب پارے کو مختلف اور متعدد عینکوں سے دیکھ کر تحریر کرتے تھے
اور ان کی بہت ساری وابستگیاں ان کی تحریروں سے واضح ہو جایا کرتی تھیں جب کہ منٹو نے
ادیب کی ذمے داری کو محدود دائرے میں رکھا، وہ کبھی جج نہیں بنتا، وہ کبھی ڈاکٹر یا معالج کا
کردار ادا نہیں کرتا، وہ کبھی مصلح نہیں بنتا۔ وہ پہلے فوٹو گرافر کی طرح تصویریں اتارتا ہے پھر
ادیب کی طرح ان میں زبان و بیان کے حسب ضرورت رنگ بھرتا ہے اور بس۔
پروفیسر محمد حسن عسکری نے منٹو کے 'سیاہ حاشیے' کے افسانوں/افسانچوں کا جائزہ لیتے
ہوئے لکھا ہے:

''انھوں نے چند واقعات تو ضرور ہوتے دکھائے ہیں مگر یہ کہیں
نہیں ظاہر ہونے دیا کہ یہ واقعات یا افعال بنفسہٖ اچھے ہیں یا
برے، نہ انھوں نے ظالموں پر لعنت بھیجی ہے نہ مظلوموں پر آنسو
بہائے ہیں۔ انھوں نے تو یہ تک فیصلہ نہیں کیا کہ ظالم لوگ
برے ہیں یا مظلوم اچھے ہیں...''

محمد حسن عسکری مزید تحریر کرتے ہیں:

''انھوں نے نیک و بد کے سوال ہی کو خارج از بحث قرار دے دیا ہے۔ان کا نقطۂ نظر نہ سیاسی ہے نہ عمرانی، نہ اخلاقی بلکہ ادبی اور تخلیقی۔منٹو نے تو صرف یہ دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ ظالم یا مظلوم کی شخصیت کے مختلف تقاضوں سے ظالمانہ فعل کا کیا تعلق ہے۔ظلم کرنے کی خواہش کے علاوہ ظالم کے اندر اور کون کون سے میلانات کارفرما ہیں۔انسانی دماغ میں ظلم کتنی جگہ گھیرتا ہے۔زندگی کی دوسری دلچسپیاں باقی رہتی ہیں یا نہیں۔منٹو نے نہ تو رحم کے جذبات بھڑکائے ہیں، نہ غصے کے، نہ نفرت کے، وہ تو آپ کو صرف انسانی دماغ، انسانی کردار اور شخصیت پر ادبی اور تخلیقی انداز سے غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔''(سیاہ حاشیے۔ص 14۔13)

پروفیسر محمد حسن عسکری نے 'سیاہ حاشیے' کے مقدمے'' حاشیہ آرائی'' میں افسانچوں کو لطیفے بھی لکھا ہے۔ مجھے محمد حسن عسکری کے اس رویے سے سخت اختلاف ہے۔نہ صرف محمد حسن عسکری بلکہ ان تمام ناقدین اور مبصرین سے مجھے اختلاف ہے جنھیں'' سیاہ حاشیے'' کے افسانچے لطیفے نظر آتے ہیں۔دراصل یہ تو اپنی اپنی نظر کی بات ہے۔'' سیاہ حاشیے'' کے تمام افسانچے کسی نہ کسی طور فرقہ وارانہ فسادات کے موضوع کو Touch کرتے ہیں۔ان میں انسان کے حیوان بن جانے، اس کی کمینگی، بدکاری، مکاری و عیاری، دوغلہ پن، ذہنی خباثت کو پیش کیا گیا ہے۔ان کو پڑھ کر اگر کسی کو ہنسی آجاتی ہے تو یہ اس کا اپنا ذہنی رویہ ہے۔ بہت سے لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں جو کسی کی پریشانی میں خوش ہوتے ہیں۔کوئی سڑک پر ٹھوکر کھا کر گر جائے تو تماش بین ہنستے ہیں لیکن کوئی ان ہی میں سے اسے اٹھانے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں سماج میں۔شاید پروفیسر عسکری نے اس لیے انھیں لطیفہ کہہ دیا ہوگا کہ اس عہد میں افسانچے کا چلن نہیں تھا نہ اتنی ہی چھوٹی تحریریں سماج

میں عام تھیں یعنی ہاتھی جیسی قد آور اصناف سخن کی موجودگی میں چیونٹی جیسی ہیئت کے فن پارے لطیفے ہی لگتے ہوں گے۔ ویسے ان تمام میں لطیفے جیسی کوئی صفت نہیں ہے۔ یہ تو ادب پارے ہیں جو قاری کو غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں۔ اس پر طنز کستے ہیں، اسے شرم دلاتے ہیں۔ اسے ہنسانے کے لیے نہیں ہیں۔ منٹو کے افسانچے 'پٹھانستان'، 'خبردار'، 'ہمیشہ کی چھٹی'، 'حلال اور جھٹکا'، 'کھاد'، 'استقلال'، 'جوتا'، 'سوری'، 'پیش بندی'، 'رعایت'، 'صدقے اس کے'، 'اشتراکیت'، 'اُلہنا'، 'آرام کی ضرورت'، 'قسمت'......الغرض ہر افسانچہ قابل مطالعہ ہے اور اپنے اندر طویل کہانیاں لیے ہوئے ہیں۔

رعایت

''میری آنکھوں کے سامنے میری جوان بیٹی کو نہ مارو۔''

''چلو اسی کی مان لو...کپڑے اتار کر ہانک دو ایک طرف۔''

تقریباً دو سطر (سیاہ حاشیے میں چار سطروں میں ہے) کا یہ افسانچہ قاری کو اندر تک دہلا دیتا ہے۔ ایک جوان بیٹی کے باپ کو رعایت دی جا رہی ہے۔ یہاں ظالم موجود نہیں، ظلم موجود ہے۔ ظلم کا نیا طریقہ کار موجود ہے۔ منٹو نے فساد کے کسی ہول ناک، منظر کا بیان نہیں کیا ہے۔ لیکن ظلم کی شدت اور اس سے پیدا ہونے والی لہریں خود بخود الفاظ سے قاری کے ذہن ودل تک کا سفر طے کر لیتی ہیں۔ یہاں منٹو کی رعایتِ لفظی، فنی چابک دستی، موضوع پر گرفت، عنوان کی برجستگی وغیرہ نے مل کر ایک ایسا فن پارہ گھڑا ہے کہ منٹو کے قلم کے جادو کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ لفظوں میں سادگی ہے، سلاست ہے، کوئی سنسنی خیزی نہیں، کوئی فحاشی نہیں، ظلم وزیادتی کے ڈھول نہیں اور نہ ہی قاری کو دہشت زدہ کرنا مقصد ہے۔

افسانچے پر ایک نظر ڈالیں:

سوری

''چھری پیٹ چاک کرتی ہوئی ناف کے نیچے تک چلی گئی۔

آزار بند کٹ گیا۔ چھری مارنے والے کے منہ سے دفعتہً کلمۂ

تاسف نکلا

''چ.....چ.....چ.....چ..........مشٹیک ہوگیا۔''

اس افسانچے میں منٹو کا فن عروج پر ہے۔فساد کے ماحول میں اپنے فرقوں کا تحفظ اور غیر فرقے پر منصوبہ بند حملہ عام بات ہو جاتی ہے۔لوگوں کی شناخت مذہب کے اعتبار سے کی جانے لگتی ہے۔اس افسانچے میں منٹو نے سفاک حقیقت نگاری کا عمدہ نمونہ پیش کیا ہے۔قتل کے بعد کا افسوس،افسانچے کا ڈرامائی موڑ ہے۔منٹو نے اس افسانچے میں بہت ہی کم الفاظ میں پوری شدومد کے ساتھ اپنی بات کی ترسیل کی ہے۔پورے افسانچے میں بس ایک واقعہ ہی درج ہے۔لیکن یہ واقعہ اپنے اختتام پر قاری کے اندر سرایت کر جاتا ہے اور اپنے ساتھ ان کہے اور نا تحریر کردہ(Unsaid and unwritten) سینکڑوں واقعات جمع کر لیتا ہے۔قاری مبہوت سا ہو کر رہ جاتا ہے۔اسے بہت دیر تک کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہوا؟ افسوس کس کو ہو رہا ہے؟ کس بات کا افسوس؟ کون سی غلطی ہوگئی۔مشٹیک لفظ قاری کو لمحاتی طور پر خالی الذہن کر دیتا ہے۔تھوڑی دیر بعد جب قاری خود کو سنبھالتا ہے تو سوچتا ہے کہ منٹو نے لوہے کی گرم سلاخ اس کے ذہن کے پار کر دی ہے۔قاتل کا چ... چ...چ...چ...کرنا منظر کو ایسا زندہ کرتا ہے کہ گویا قاری کے سامنے یہ قتل ہوا ہو۔

سعادت حسن منٹو کے بعد اس صنف کو استحکام و استناد عطا کرنے والے جوگندر پال ہیں بلکہ نام افسانچہ بھی جوگندر پال کا ہی دیا ہوا ہے۔جوگندر پال اردو کے کہنہ مشق ناول نگار اور افسانہ نگار ہیں۔انھوں نے افسانچے کو اپنی کاوشوں سے مضبوط بنیادیں عطا کیں۔ جوگندر پال جب ادب میں داخل ہوئے تو نئی روشنی سے معمور تھے۔انگریزی کے استاد ہونے کے ساتھ ساتھ آپ نے غیر ممالک خصوصاً جنوبی افریقہ میں خاصا وقت گذارا۔ان کے افسانے،ناول اور افسانچے ان کی بالیدہ نظر،نئی فکر اور فن پر مضبوط دسترس کے غماز ہیں۔ جوگندر پال نے افسانچے کو نہ صرف نام دیا بلکہ متعدد تجربات کرتے ہوئے افسانچے کو استحکام بھی بخشا۔انھوں نے ''نہیں رحمٰن بابو'' کے عنوان سے سینکڑوں افسانچے قلم بند کیے۔انھیں

اردو افسانچے کا سعادت حسن منٹو کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ان کے دو افسانچے ملاحظہ کریں:

کچا پن

''بابا،تم بڑے میٹھے ہو''

''یہی تو میری مشکل ہے بیٹا۔ابھی ذرا کچا اور کھٹا ہوتا تو جھاڑ سے جڑا رہتا''

یہ دو سطر کا افسانچہ اپنے اندر مکمل کہانی لیے ہوئے ہے۔یہ علامتی افسانچہ ہے۔میٹھا ہونا، کئی طرف اشارے کر رہا ہے۔یعنی پھل بہت میٹھا ہے اور جب کوئی پھل زیادہ میٹھا ہوتا ہے تو وہ یا تو خود بخود ٹوٹ کر شاخ سے الگ ہو جاتا ہے یا پھر زمانے کے ذریعہ توڑ لیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس کچے اور کھٹے پھل مضبوطی سے پیڑ سے جڑے ہوتے ہیں۔اسے نہ صرف پیڑ کے اندرون سے غذا حاصل ہوتی رہتی ہے بلکہ پیڑ کے مالک اور محافظ اس کی خاطر مدارت بھی کرتے رہے ہیں۔اس کا ہر طرح کا خیال رکھا جاتا ہے۔یہی معاملہ بزرگوں کا بھی ہے۔آج کل اولادیں اپنے والدین کو گھر سے نکال دیتی ہیں۔پورا افسانچہ سماج پر ایک گہرا طنز ہے۔

بے درد

''آخر اس کا درد تھم گیا،

اور درد تھمتے ہی اسے چین آ گیا،

لیکن نہ تھمتا تو بے چارہ مرنے سے بچ جاتا۔''

'بے درد' نام کا یہ افسانچہ جوگندر پال کے عمیق ذہن کی فکری غوطہ زنی ہے۔افسانچے میں کون بے درد ہے۔بے درد یعنی ظالم، وہ جس نے اس کے درد کا علاج کر دیا۔یعنی اسے مار ڈالا، لیکن بظاہر تو وہ اس کا ہمدرد ہے کہ اس سے اس کا درد، دیکھا نہ گیا اور اس نے اسے مار کر ہمیشہ کے لیے درد سے نجات دلا دی۔قاری یہ طے نہیں کر پاتا ہے کہ اسے درد سے نجات دینے والا اس کا ہمدرد ہے یا بے درد۔اس میں ایک پہلو اور ہے۔بے درد، یعنی ایسا شخص جس کے پاس درد نہ ہو۔یعنی وہ صاحب درد، اب بے درد ہو گیا۔اسے ہمیشگی کا سکون

عطا ہو گیا ہے۔ آپ کسی ایسے مریض کا تصور کریں جو بری طرح زخمی ہو، جس کی سانسیں اکھڑ رہی ہوں۔ دوا کا اثر نہ ہو رہا ہو اور اس کی یہ حالت طوالت اختیار کر گئی ہو۔ پھر کیا ہوتا ہے۔ پھر ہر کوئی اس کے دکھ درد کو دیکھ کر اس کی موت کی تمنا کرتا ہے۔ بے درد ایسے ہی کسی مریض کی حالت کا بہترین ترجمان ہے۔

افسانچے کے فروغ میں جوگندر پال کے ہم عصر افسانہ نگار رتن سنگھ کا بھی اہم کردار رہا ہے۔ انھوں نے افسانچے کو ایک نیا انداز دیا۔ انھوں نے افسانچوں کے عنوانات قائم نہیں کیے۔ ان کے افسانچوں کا مجموعہ 'مانک موتی' کے نام سے منظر عام پر آیا اور مجموعے میں عنوان کے بجائے نمبر شمار سے افسانچے درج ہیں۔ ابھی حال ہی میں پنجابی میں ان کے افسانچوں کے مجموعے "کن من کلیاں" نے شائع ہو کر خاصی مقبولیت حاصل کی ہے۔ لیکن رتن سنگھ اپنے اس نظریے پر آج بھی قائم ہیں کہ طوالت یا اختصار کے سبب کہانیوں کو خانوں میں تقسیم نہ کیا جائے۔ ان کا ایک مانک موتی ملاحظہ کریں۔

مانک موتی ﴿۳۶﴾

"ہنستے ناچتے خوشیاں مناتے ایک ہجوم کو قریب آتا دیکھ کر ایک بھکارن نے اپنے تین چار سال کے بچے کو جلدی سے گود میں اٹھا لیا اور ایسی آڑ میں لے گئی جہاں سے بچہ ان رنگ رلیاں منانے والوں کو نہ دیکھ سکے۔ نا بابا نا، وہ بڑبڑاتے جا رہی تھی۔

"میرے ننگے بھوکے بچے نے اگر ہنسا سیکھ لیا تو کل کو اسے بھیک کون دے گا۔"

رتن سنگھ کا یہ افسانچہ نفسیاتی افسانچہ ہے۔ نفسیات کے ساتھ ساتھ معاشیات کا بھی دخل افسانچے کو نیا رخ عطا کرتا ہے۔ ایک غریب بھکارن کا سہارا اس کی گود کا بچہ ہوتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کو دیکھ کر لوگ عورت کو جلدی بھیک دے دیتے ہیں اور اگر بچہ روتا دھوتا ہو، بیمار ہو، ہاتھ پاؤں ٹیڑھے میڑھے ہوں تو زیادہ بھیک ملتی ہے۔ عورت کی اس

نفسیات کا، یہ افسانچہ عمدگی سے ترجمانی کرتا ہے۔ افسانچہ قاری کو متحیر کر دیتا ہے۔ قاری کبھی عورت پر رحم کھاتا ہے تو کبھی اسے، اس بچے کی زندگی پر رحم آتا ہے اور اسی طرح قاری بہت دیر تک دونوں کے درمیان ہچکولے کھاتا رہتا ہے۔

بشیر مالیر کوٹلوی نے افسانے کے ساتھ ساتھ افسانچے کی بھی خدمت کی ہے اور اپنی منفرد پہچان قائم کی ہے۔ وہ افسانچے میں نپے تلے جملے مرکزی کردار سے وابستہ، قصہ پن، مقصدیت کو اپنے مخصوص انداز میں استعمال کرتے ہیں۔ ان کی یہ صفت ان کے افسانچوں کو تیز دھاری تلوار جیسا بنا دیتی ہے۔ ان کا ایک افسانچہ ''صلیب سے بڑھ کر'' ملاحظہ کریں:

صلیب سے بڑھ کر

''وہ مسیحا تو نہ تھا مگر دین دکھیوں کا سچا خدمت گار تھا۔ اس کو خدمت خلق کے جرم کی سزا، ابن مریم سے کہیں زیادہ ملی تھی۔

اس غیر ملکی فرشتہ خصلت انسان پر پٹرول ڈال کر جب آگ لگائی گئی تو جیپ کے اندر اس نے اپنے دونوں بچوں کو جلتے ہوئے دیکھنے کا کرب بھی جھیلا تھا۔''

بشیر مالیر کوٹلوی نے فنی مہارت سے افسانچے میں پوری داستان کو سمو دیا ہے۔ ایک ایسی درد بھری داستان جس میں سب کچھ موجود ہے۔ ایک خاندان، خاندان کا مکھیا، اس کے دو بچے، اس کی پوری زندگی، ایمان داری اور دوسروں کی خدمت کی گواہ۔ نیک، شریف، ہر وقت دوسرے کے کام آنے والا شخص... غیر ملکی سرزمین پر خدمتِ خلق کرنے والا ایک شریف النفس شخص، لیکن اسے اس کی شرافت کا انعام یہ ملا کہ نہ صرف اسے بلکہ اس کے دو معصوم بچوں کو بھی زندہ جلایا گیا اور یہ حرکت کس نے کی، محافظ دستے نے، جس پر حفاظت کا ذمہ ہوتا ہے وہی درندہ بن گیا۔ بشیر مالیر کوٹلوی نے مناسب ترین لفظوں میں ایک دردناک کہانی کو افسانچے کے قالب میں ڈھالنے کا لائق تحسین کام کیا ہے۔

اردو میں ڈاکٹر ایم اے حق واحد ایسے تخلیق کار ہیں جو افسانچہ نگاری کی بنیاد پر ہی مشہور

ہیں۔ایم اے حق صرف اور صرف افسانچہ نگار ہیں۔شاید وہ اس طرح کے واحد افسانچہ نگار ہیں۔ورنہ زیادہ تر افسانہ نگار ہی افسانچہ نگار ہیں۔ایم اے حق نے افسانچہ نگاری میں واقعی اپنی مہارت کے ثبوت پیش کیے ہیں۔ان کا افسانچوں کا پہلا مجموعہ ''نئی صبح'' کو خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔اب انھوں نے ''موج ادب'' سہ ماہی کے ذریعہ بھی افسانچوں کی اشاعت میں خاصی محنت کی ہے اور رسالے میں افسانچے مسلسل شائع ہورہے ہیں۔ان کا ایک افسانچہ ملاحظہ کریں:

مجرم

''میری بیٹی ٹرین کے باتھ روم سے واپس آتے ہی بولی
''پاپا آپ ابھی تک غلط ہندی لکھتے ہیں۔''اور میں دوہری شرم
سے گڑ گیا۔''

دو سطروں میں ایک پوری کہانی ازشروع تا آخر انگڑائی لے رہی ہے۔چھوٹی سی کہانی اپنے اندر کتنے Dimension رکھتی ہے۔افسانچہ نگار نے ٹرین کے باتھ روم کی دیواروں پر فحش جملے لکھنے اور تصاویر بنانے والوں کو بے نقاب کیا ہے۔ہم سب کا آئے دن ایسے جملوں اور تصاویر سے واسطہ پڑتا ہے لیکن ہم اس کے تدارک کے لیے کچھ نہیں کرپاتے سوائے اس کے لکھنے والوں کو کبھی زبان سے کبھی دل کے اندر دو چار صلواتیں سنا کر خود کی ذمے داری سے سبک دوش ہوجاتے ہیں۔مگر''مجرم''افسانچہ ایسے حضرات کو ایسی شرم دلاتا ہے کہ اگر واقعی ان کے اندر کچھ رواداری، اقدار اور شرم باقی ہو تو انہیں ڈوب مرنا چاہیے۔ لفظ''دوہری''افسانچے کے اثر کو کئی گنا بڑھا دیتا ہے۔

افسانچے کی روایت کو استحکام بخشنے والوں میں اورنگ آباد کے عارف خورشید کا نام خاصی اہمیت کا حامل ہے۔عارف خورشید کے افسانچوں کا مجموعہ''یادوں کے سائے'' 1987 میں منظر عام پر آیا۔ان کی باریک بین نگاہ افسانچے میں نئے تیور پیدا کرتی ہے۔وہ عورت مرد کے مابین رشتوں کو بڑی فن کاری سے افسانچے میں پیش کرتے ہیں:

سوالیہ نشان

''جنت میں غلطی کی سزا.....دنیا

''دنیا میں غلطی کی سزا.......؟

شوہر دبئی میں خود ہندوستان میں،

دونوں اپنی اپنی آگ میں''

سوالیہ نشان قاری کے ذہن کو جھنجھوڑتے ہوئے بے شمار سوال داغ دیتا ہے۔ قاری کا ذہن سوالات کے گھیرے میں آ جاتا ہے۔ افسانچہ اپنے آپ میں پورے ناول کی کہانی سموئے ہوئے ہے۔ جنت سے آدم کے نکالے جانے کے واقعے سے موجودہ عہد کے سلگتے ہوئے روزگار اور جنسی مسائل کو فنی کاوش سے قصے میں پرو دیتا ہے۔ افسانچے میں مرد کی دنیا بھی آباد ہے اور عورت کا جہاں بھی۔ دونوں ایک دوسرے کی فرقت کا شکار بھی ہیں اور اپنی اپنی دنیاؤں میں خوش بھی۔ ہر دو طرف اپنی اپنی آگ سلامت ہے۔ یہ آج کے دور کے نفسا نفسی کے ماحول کی خوبصورت عکاسی ہے۔

عظیم راہی نے افسانچہ نگاری کے دوطرفہ فروغ میں تعاون دیا ہے۔ انھوں نے نہ صرف عمدہ افسانچہ نگاری کی ہے بلکہ انھوں نے افسانچہ نگاری کی تنقیدی روایت کو بھی بنیاد فراہم کرنے کا اہم کام کیا ہے۔

انھوں نے اردو میں افسانچہ کی روایت؛ تنقیدی مطالعہ کتاب لکھ کر افسانچہ نگاری کی تنقید میں میل کا پتھر ثبت کیا ہے۔ ان کی یہ کتاب 2009 میں منظر عام پر آئی ہے اور اس کتاب کی اشاعت کے بعد افسانچہ نگاری کی مقبولیت میں روز افزوں فروغ حاصل ہوا ہے۔ افسانچہ لکھنے، افسانچے پر تنقید اور افسانچے کے فروغ کے لیے عملی کاوشوں کو ایک نئی سمت ملی ہے۔ عظیم راہی کا ایک افسانچہ ملاحظہ ہو:

چلن

''وہ شخص، جس نے میرے قتل کی سازش رچی تھی
معجزاتی طور پر.....میرے بچ جانے پر.....
مبارک باد دینے والوں میں وہی سب سے آگے تھا۔''

عظیم راہی نے ''چلن'' میں سماج کے منافقانہ رویے کی قلعی کھول کر رکھ دی ہے۔ یہ افسانچہ سفید کالر اور سیاہ دل لوگوں، ڈھونگی مذہبی رہنماؤں، دوغلی شخصیت کے مالک افراد کی زندگی پر کاری ضرب ہے۔ آج زمانہ اس طرح کا ہوگیا ہے۔ سیاسی لوگ پہلے کسی کیس میں پھنساتے ہیں اور بعد میں ہمدردی جتانے پہنچ جاتے ہیں۔
نذیر فتح پوری اردو کے زود نویس ادیب و شاعر ہیں۔ انھوں نے ادب کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ افسانچہ نگاری میں بھی وہ کامیاب ہیں۔ ان کے افسانچوں کا مجموعہ ''ریزہ ریزہ دل'' بہت پہلے شائع ہو چکا ہے۔ ان کا ایک افسانچہ ملاحظہ کریں:

ترقی

''آدمی نے کمپیوٹر بنایا اور کمپیوٹر بننے کے بعد آدمی خود بگڑ
گیا۔ کمپیوٹر کی خرابی آدمی دور کر سکتا ہے۔
لیکن آدمی کے بگاڑ کا علاج؟؟؟''

تین سطروں کا افسانچہ 'ترقی' موجودہ عہد کی کامیاب ترجمانی کرتا ہے۔ آج کا عہد IT کا عہد ہے۔ اس IT کے عہد میں ہر طرف کمپیوٹر ہی کمپیوٹر ہے۔ ہر کام کمپیوٹر کر رہا ہے۔ Internet نے آج انسان کو ہر طرح کی سہولتیں مہیا کرا دی ہیں۔ آج انسان کے پاس رشتوں ناطوں کے لیے وقت نہیں ہے۔ وہ کمپیوٹر کی طرح اسکرین اور ماؤس ہوگیا ہے۔ انسان میں آنے والے اس بگاڑ کا کیا علاج ہے۔ Porn sites, social sites نے واقعی آج کے انسان کو کردار کی سطح پر خاصا خراب کر دیا ہے۔ انسان کے اندر ایسی خرابی پیدا

ہو چکی ہے جس کا کوئی علاج نہیں ہے۔ یہ انسانی ترقی ہے یا؟ افسانچہ ایک سوالیہ نشان چھوڑ کر قاری کو بے چین کر جاتا ہے۔

میں نے یہاں چند افسانچوں کا تجزیہ اپنے طور پر کیا ہے۔ آج افسانچہ نگاروں کی ایک طویل فہرست ہے لیکن یہاں مقصد فہرست سازی نہیں ہے۔ سینکڑوں افسانچہ نگار آج مستعدی سے افسانچے لکھ رہے ہیں۔ پچاس سے زائد افسانچوں کے مجموعے زیور طباعت سے آراستہ ہو کر شائع ہو چکے ہیں۔ یہاں میں نے اپنی پسند سے چند افسانچے پیش کیے ہیں۔ ان افسانچوں کے انتخاب میں، میں نے ایک خاص خیال رکھا ہے۔ کہ یہ سب کے سب دو تین یا چار سطروں کے افسانچے ہیں اور سب کے سب اپنے اندر طویل کہانی کا لاوا لیے ہوئے قطرے میں سمندر کی مثال ہیں۔ افسانچہ اسی طرح اپنے قارئین کو موضوع کے تیکھے پن، اختصار، زبان کی چابک دستی اور غیر متوقع اختتام سے سحر زدہ کر دیتا ہے۔ لیکن اس کا مطلب قطعی یہ نہیں کہ ان سے کچھ طویل یا دو تین صفحات کے افسانچے یہ کام بخوبی نہیں کر پاتے ہیں۔ وقت کی کمی کے باعث میں نے قدرے مختصر افسانچے اپنے مطالعے میں شامل کیے ہیں بعد میں ہر طرح کی افسانچے کا مطالعہ پیش کرنے کا ارادہ ہے۔

افسانچے کے فروغ کے لیے مشورے:

افسانچے کے فروغ میں رسالوں اور میگزین کا بہت اہم کردار رہا ہے اور اس سلسلے میں 'شمع' کے کردار سے کسی طور انکار ممکن نہیں۔ شمع نے افسانچوں کو ہمیشہ اپنے صفحات پر جگہ دی۔ کبھی ایک صفحے کے افسانچے ''اسی صفحے پر مکمل'' کے Tag کے ساتھ اور کبھی مختصر مختصر اور کبھی منی کہانی کے لیبل کے ساتھ افسانچوں کو تصاویر سے مزین، دیدہ زیب بنا کر شائع کرنا۔ شمع کے افسانچوں نے افسانچے کے فروغ میں خاصا اہم کردار ادا کیا ہے۔

'شمع' کے ساتھ ساتھ اردو میں کئی فلمی میگزین اور رسالے شائع ہوئے ان میں 'روبی'، 'فلمی ستارے'، 'گلفام'، 'فلم ویکلی' وغیرہ رسائل نے بھی افسانچوں کی اشاعت میں مستقل حصہ لیا۔ یہی نہیں اردو روز نامہ، اخبارات کے اتوار کے ضمیمے بھی افسانچوں سے مزین

ہوتے تھے۔'اخبار مشرق'، 'آزاد ہند'، 'اقرا'، 'انقلاب'، 'راشٹریہ سہارا'، 'عظیم آباد ایکسپریس'، 'سنگم'، 'فاروقی تنظیم'، 'قومی تنظیم'، 'سیاست'، 'ہند سماچار'، 'تیج'، 'پرتاپ'، 'ملاپ'، 'اردو ٹائمز'، 'آگ'، 'صحافت' اور 'سالار' جیسے اہم اردو روزناموں میں افسانچوں کی مسلسل اشاعت ہوتی رہی ہے۔ہفت روزہ اخباروں میں بھی افسانچے شائع ہوتے رہے ہیں۔

ادبی رسائل میں 'شاعر' نے افسانچے کے فروغ میں خاصا اہم کردار ادا کیا ہے۔'شاعر' نے افسانچہ نمبر، افسانچے پر خاص شمارے، افسانچہ نگاروں کے گوشے وغیرہ شائع کر کے اپنا ایک الگ مقام بنا لیا ہے۔اسی طرح 'آج کل'، 'اسباق'، 'رہنمائے تعلیم'، 'پاسبان'، 'پرواز ادب'، 'چنگاری'، 'موجِ ادب'، 'روشن ادب'، 'روشن چراغ'، 'گونج' وغیرہ رسائل نے اپنے افسانچے شائع کر کے اس کے فروغ میں حصہ لیا۔

افسانچہ

(مبشر علی زیدی)

مکان

''میں نے تین منزلہ مکان اس لیے بنایا تھا کہ میرے بچے ہمیشہ ایک ساتھ رہیں۔'' بابا اکثر یہ بات کہتے تھے۔لیکن ان کا انتقال ہوتے ہی ہم نے مکان بیچنے کا فیصلہ کیا۔نہ ہم تینوں بھائی ایک ساتھ رہ سکتے تھے، نہ ہماری بیویاں۔اخبار میں اشتہار دیکھ کر کئی خواہش مند آئے۔ایک صاحب سے معاملہ طے پا گیا۔میں نے ان سے بیعانہ لے کر پوچھا، ''آپ کو یہ مکان کیوں پسند آیا؟''

''میرے تین بیٹے ہیں۔'' انھوں نے بتایا، میں تین منزلہ مکان اس لیے خریدنا چاہتا ہوں کہ میرے بچے ہمیشہ ایک ساتھ رہیں۔

افسانچہ نگاری

سرور غزالی

افسانے کا اردو زبان میں ایک مقام ہے اور اسے ایک باقاعدہ صنف کی حیثیت حاصل ہے۔ افسانہ ایک مستحکم ادبی مقام کا بھی حامل ہے۔ مختصر افسانے یا افسانچے کا معاملہ اتنا سیدھا اور آسان نہیں۔ افسانے کے بارے میں ہمیشہ یہ بحث بھی چلتی رہتی کہ آیا افسانہ کہانی کے بغیر ادھورا ہے یا علامات کے بغیر اس کی فنی خوبی ابھرنے سے رہ جاتی ہے اور اسی بحث کے اختتام کے اگلے موڑ پر افسانچہ کھڑا اپنی باری کا منتظر ہے کہ اسے کسی بحث میں شامل کیا جائے۔ اس کی ادبی اہمیت کے پیش نظر اسے اس کا مقام دلایا جائے۔ اس کے مقام کا تعین کیا جائے۔ افسانہ تو خیر اپنی اس علاماتی یا کہانی کی تلاش میں ٹھوکریں کھاتے رہنے کے باوجود اپنی اہمیت اور مقام کی وجہ سے مشکوک نہیں۔ لیکن افسانچے یا مختصر افسانے کے ساتھ اس کے جنم لینے کے ساتھ ہی یہ ظلم ہوا کہ اسے کسی ادبی صنف میں جگہ دینے سے گریز کیا گیا بلکہ اسے اس کے مقام سے گرانے کی ہر ممکنہ کوشش کی گئی۔

سعادت حسن منٹو کو قلم کار نہ ماننے والے آپ کو آج بھی مل جائیں گے۔ خواہ ایسے لوگوں کو تلاش کرنے کے لیے کونے کھدرے میں ہی کیوں نہ جانا پڑے۔ ممکن ہے آپ کو اردو کے بعض باباؤں کے ذہن کے اندر جھانکنا پڑے، کیوں کہ زبان سے وہ بھی کچھ نہ بولیں گے اور یہی خاموشی دراصل اردو زبان کی ہر صنف کے لیے سمِ قاتل ہے۔ ہر اس مصنف کے حوصلے پست کرنے کا سبب ہے جو روایت سے ہٹ کر نئی اختراع ڈالنا چاہتا

ہو۔ سعادت حسن منٹو کو صرف ان کے اپنے ہم عصروں کی جانب سے ناقدری کا دکھ نہیں تھا بلکہ اس بھی زیادہ ان پر چلنے والے مقدمات اور معاشرے میں ان کے پیش کردہ خیالات پر بیہودگی کا ٹھپا لگنا، سب باتوں کا انھیں سامنا کرپڑا۔ جب کہ منٹو کی مخالفت میں اس کے سامنے تن کر کھڑے ہونے والے سب کے سب لمبے لمبے سائے ہی ثابت ہوئے اور دن ڈھلتے ہی ایسے غائب ہوئے کہ صرف منٹو ہی باقی رہا۔ یہی حال افسانچوں کا بھی ہوا۔ افسانچوں کو لطیفے سے معمور کرنے والے آج بھی اپنے خیالات رسائل میں لکھ کر بھیجتے رہتے ہیں۔ رہی بات کہ فن کے اچھے یا برے ہونے کی، تو اس فن کے اعلیٰ اور عامیانہ ہونے کا پیمانہ وہی ہے جو اعلا اور ادنا غزل کے لیے ہے۔ ہر افسانچہ لکھنے والا منٹو نہیں ہوتا نہ ہی ہر افسانچہ ''کتبہ'' ہوتا ہے۔ افسانچے کے نام پر یقیناً کچھ لوگ لطیفے بھی لکھ کر اپنا کام چلا رہے ہیں۔ لیکن اس سے فنِ افسانچہ کا نہیں اس فن کار کا مقام گھٹ جاتا ہے۔ افسانچے عموماً اور منٹو کے افسانچے خصوصاً بچوں کے لیے نہیں لکھے گئے ہیں۔ نہ ہی انھیں بچوں کو پڑھنا چاہیے۔ اس سے نابالغ اذہان پر برا اثر پڑتا ہے۔ ادب تو ہے ہی بالغ نظری کا نام۔

افسانچوں کو افسانچے کے اوزان پر پورا اترنا چاہیے۔ افسانچوں کو، مختصر افسانے کی پٹری سے اتار کر لطیفہ گوئی کے سمندر میں غرقاب نہیں کرنا چاہیے۔

دوسری بات یہ ہے کہ میں خود علامات کا قائل ہوں سیدھی اور سچی علامات جو دل کو چھو جائیں اور عام قاری بھی سمجھ جائے کہ قلم کار کیا کہنا چاہتا ہے۔ میں ایسی علامات کو بھی غیر موثر سمجھتا کہ جنھیں عام قاری تو دور ادب کا طالب علم اور استاد بھی سمجھنے سے قاصر ہو۔ کہانیوں میں کہانی بھی ہو اور علامت بھی اور کہانی بھی کیسی؟ معاشرے کی جیتی جاگتی سچی تصویر اور پھر اس میں اسلوب و بیان کا وہ زور ہے کہ قاری کو اپنی جانب متوجہ کرنے کے ہنر سے لیس ہو تو بات ہی کیا۔

افسانچوں میں وہ ساری بات پوشیدہ ہو جو ایک افسانچے کا خاصہ ہے۔ چند جملوں میں پوری کہانی پیش کرنے کا نام ہی افسانچہ نگاری ہے۔ اس کے علاوہ ان میں بیان کرنے کا ہنر

ہوتو مختصر افسانچوں کا فن ابھر کر سامنے آتا ہے۔افسانچہ لکھنا بڑے دل گردے کی بات ہے۔ افسانچوں کی تعریف وتوصیف اوراس کا تجزیہ پیش کرنا بھی کچھ کم کٹھن کام نہیں۔افسانچہ لکھنا کبھی بھی دانستہ یا شعوری عمل، یعنی اسے بنانا نہیں ہوتا۔بس خیالات کے پنچھی آئے، کچھ دیر ٹھہرے اور پھرُ۔ بعد میں، تخلیق کار سوچتا ہے یہ کیا تھا۔اتنی جلدی سب پرُ جھاڑ کر اڑ گئے۔

دیپک بدکی نے افسانچوں کی خصوصیات کچھ یوں بیان کی ہیں۔

> ’’(1) پلاٹ مختصر ترین ہونا چاہیے۔اس میں زندگی کا صرف ایک واقعہ سما سکتا ہے۔ وقت کے پھیلاؤ کی بھی گنجائش نہیں۔(2) کردار کے ارتقا کی افسانچے میں گنجائش نہیں۔ (3)منظر نگاری اور بیانیہ سے گریز ہونا چاہیے۔(4)سسپنس ہومگر مختصر(5) زماں ومکاں کے لحاظ سے افسانچہ نگار کوایک ہی نقطے پرفوکس کرنا چاہیے(6)افسانچہ کوئی لطیفہ نہیں جسے قارئین کی دل جوئی کے لیے لکھا یا سنا جائے۔افسانچے میں فکروتردد کی گہرائی ہو نہ کہ بزلہ سنجی کا ہلکا پن۔

واقعہ بھی ایک ہی ہو بلکہ نہایت قلیل، کردار کا ارتقا از خود ازلی ہو یہاں اسے اس کے ارتقائی منزل میں پیش کرنے حاجت ہی نہ ہو۔منظر نگاری کی بھی ضرورت نہیں ہو۔البتہ کہانی میں جو سسپنس ہو وہ پڑھنے والے کے شعور پر بھی انحصار کرے کہ وہ اس میں کیا کچھ سمجھ رہا ہے یا نہیں سمجھ رہا ہے۔کہانی کے اندر کہانی ہے تو یہی سسپنس ہے کہ کہانی کا انجام کیا ہے۔

افسانچوں کے خیالات کی وسعت اور شعور کی بالیدگی ہی اس کے ظہور میں آنے کا سبب بنتی ہے۔مذہب وملت کی حدوں سے پرے،رنگ ونسل کی تقسیم کی سطحی سوچ سے بہت دور کہیں رہ کر اپنے بالیدہ شعور کی تسکیں کے لیے لکھا جائے تو بات بنتی ہے۔قلم کار کا دردمند دل،روزمرہ کے مسائل سے نبرد آزما انسان کی بے چارگی سے آشنا ہو۔فن برائے فن نہیں۔ بلکہ معاشرے کی بدحالی کو بہتری کی جانب لے جانے کی ایک کوشش ہو تو افسانچہ جنم لیتا

ہے۔ایک مصنف، شاعراورفن کار کی یہی خصوصیات اسے اعلا مقام دلاتی اوراس کافن قاری یا سامع کے دل میں جگہ بناتا ہے۔جن مسائل پر قلم اٹھایا جائے وہ ہماری آج کی زندگی کے ہی ہوں۔معاشرے نے ترقی تو کرلی ہےلیکن ابھی بھی ان مسائل سے معاشرے کو چھٹکارہ نہیں ملا ہے۔اوراس کی وجہ ہمارے معاشرے کی ناہمواری ہے۔دولت کی غلط تقسیم،قانون کی بالا دستی کی عدم موجودگی، افسانچوں کے اہم موضوعات ہیں۔جہاں بھی صرف چند سطروں میں پیچیدہ مسائل کو بیان کیا گیا ہے۔وہ افسانچہ اہم سمجھا جائے گا۔ ہمارے معاشرے کے پرانے اور پہلے سے موجود مسائل ابھی ختم بھی نہیں ہوئے کہ ان ہی کی کوکھ سے نئے مسائل نے جنم لینا شروع کردیا ہےاور قاری اور قلم کاراس کے حل کی تلاش میں پھر رہا ہے۔قلم کارکا شعوراگر مسائل کا حل نہیں تو کم ازکم مسائل کوتو پیش ہی کرسکتا ہے کہ قاری کو احساس ہوکہ کسی کوتواس کے دکھ کاادراک واحساس ہے۔

عصر حاضر کے افسانچہ نگاروں میں، جوگندر پال، پرویز بلگرامی، محمد بشیر مالیرکوٹلی، ایم اے حق، مبشر زیدی، جاوید نہال حشمی، کرن صدیقی، صدف آصف، اقبال خورشید، ساجد سومرو، اسلام حمید، نخشب مسعود، محمد اکمل، جمیل اختر، نثار نندوانی وغیرہ شامل ہیں۔

❖❖❖

اردو افسانچہ اور زندگی کے مسائل

رونق جمال

افسانہ فارسی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنی ہیں قصہ، کہانی، داستان یا جھوٹی بات وغیرہ۔ کہانی یا افسانے کا جو رنگ روپ آج ہمارے سامنے ہے وہ انیسویں صدی سے قبل کے ادب میں اتنا واضح نہیں ہے۔ ہمارا اردو افسانہ دور جدید کی دین ہے۔ بدلتے وقت کے ساتھ انسان کے سامنے نئی نئی مشکلات اور نئے نئے مسائل پہاڑ کی مانند راہ زندگی میں آنے لگے جن کو عبور کرنے کے لیے انسانوں کے پاس جدو جہد کے پہلے ہی وقت کا فقدان ہے۔ وقت کی کمی کی وجہ سے چاہے وہ کسی بھی زبان و ادب کا قاری ہو ضخیم کتب اور ناولوں سے دوری بنانے پر مجبور ہو گیا ہے۔ ان مجبور قارئین میں اردو زبان و ادب کے قارئین بھی شامل ہیں۔ لہٰذا قاری کو مختصر ادبی پاروں کی ضرورت محسوس ہوئی تو حالات کے تقاضوں کے باعث افسانے کی ایجاد ہوئی۔ افسانہ صرف اس لئے مقبول ہوا کہ وہ مختصر ہوتا ہے اور باذوق قارئین اسے ایک ہی نشست میں ختم کر سکتے ہیں۔ افسانے کی ایجاد کے چند دہائیوں کے بعد پہلی ٹی وی اور پھر انٹرنیٹ کی ایجاد ہوئی۔ اب قاری اخبار، رسالوں اور کتب سے زیادہ وقت ٹی وی اور انٹرنیٹ کو دینے لگا۔ وقت نے ایک بار پھر کروٹ بدلی جس کے ساتھ ادب کے تقاضے بدل گئے۔ قارئین کی تعداد گھٹ گئی۔ گھٹ کر مختصر ہوئی تعداد نے مختصر ادب کی مانگ شروع کر دی۔ ادبا نے بدلتے حالات، وقت کے نازک تقاضوں اور قاری کی مانگ پر توجہ دیتے ہوئے افسانے کو مختصر کر کے پہلے مختصر افسانے، شہہ پارے، ادبی پنکھڑیاں، منی

کہانی، پوپ کہانی اور آخر میں افسانچے کے نام سے مختصر افسانے رقم کرنا شروع کر دیے۔ جنھیں مدیران نے عزت بخشی اور قارئین نے پسند کیا اور سراہا۔ آج افسانچہ قارئین کی پہلی پسند بن گیا ہے اور مقبولیت کی چوٹی پر پہنچ گیا ہے۔

افسانچے کی ایجاد نے ادب میں کھلبلی سی مچا دی ہے۔ افسانچے نے بہت تیزی سے مختصر وقت میں ادب میں اہم مقام پا لیا۔ اس لیے ادبا تو ادبا شعرا نے بھی افسانچے کی جانب توجہ دینا شروع کر دی تو ناقدین نے یہ سوال کھڑا کر دیا کہ اردو افسانچہ زندگی اور مسائل کے کتنا قریب ہے؟ ادب میں جب بھی کوئی صنف وجود میں آتی ہے اور پروان چڑھنے لگتی ہے تو ناقدین واویلا مچانے سے نہیں چوکتے۔ افسانچے کو مقبول ہوتا دیکھ ناقدین نے حسب عادت واویلا مچاتے ہوئے سوال داغ دیا کہ اردو افسانچہ زندگی اور مسائل سے کتنا قریب ہے؟ ان کا یہ سوال ہی اردو افسانچے کی مقبولیت کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ آخر کار افسانچے کو اچھوت سمجھنے والے ناقدین کی توجہ افسانچے نے اپنی جانب کھینچ ہی لی۔ افسانچے کی مقبولیت کے باعث اس طرح کے سوال اٹھنا لازمی ہے تو ہم افسانچہ نگاروں کی ذمے داری ہے کہ اس طرح کے سوالات کے معقول جوابات دیں۔ چوں کہ راقم بھی افسانچہ نگار ہے اس لیے راقم نے سوال کی اہمیت اور اپنی ذمے داری کو سمجھتے ہوئے حسب استطاعت اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔

ادب اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے اس لیے کسی نے خوب کہا ہے کہ ''ادب میں زندگی ہے، زندگی میں ادب ہے۔'' وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ نئے نئے نکات سامنے آتے رہیں گے۔ ادب اور زندگی لازم و ملزوم ہیں اس لیے میں پہلے ہی ذکر کر چکا ہوں کہ ادب اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ شاعر و ادیب تو الفاظ اور جملوں کے استعمال میں محتاط ہوتے ہی ہیں لیکن جن کا ادب سے کوئی تعلق نہیں ہے پھر بھی ان کی زبان سے روزمرہ کی بول چال میں، بحث مباحثہ میں انجانے میں ایسے ایسے نپے تلے ادبی الفاظ اور جملے ادا ہو جاتے ہیں جن کا ہم تخلیقات میں نہایت ہی سوچ سمجھ کر استعمال کرتے ہیں۔ جب ادب کا

رشتہ ہماری زندگی سے ہے تو افسانچہ بھی ادب کی ایک اہم صنف ہے پھر وہ کیسے زندگی اور زندگی کے مسائل سے اچھوتا رہ سکتا ہے۔ جس طرح شاعری میں زندگی ہوتی ہے، مسائل ہوتے ہیں، جذبات ہوتے ہیں، گہرائی ہوتی ہیں، وسعت ہوتی ہے، اسی طرح اردو افسانے میں بھی زندگی ہوتی ہے، مسائل ہوتے ہیں، کڑوی حقیقتیں ہوتی ہیں۔ بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ادب میں افسانچہ زندگی اور مسائل کے سب سے زیادہ قریب ہے۔ کیوں کہ افسانچے میں یہ کمال ہے کہ چند سطروں میں ایک مسئلے پر قلم کار بہت بڑی، بہت گہری اور نہایت تیزی سے چوٹ کر کے دھماکہ کر دیتا ہے۔ مختصر ہونے کی وجہ سے قاری کو سمجھنے میں دقت بھی نہیں ہوتی کیوں کہ قلم کار اپنے انداز میں سیدھے سیدھے مسئلے پر نشانہ لگا تا ہے۔ جس طرح مہابھارت میں ارجن کو صرف مچھلی کی آنکھ دکھائی دیتی تھی۔ اسی طرح افسانچے میں قلم کار کا نشانہ کوئی نہ کوئی زندگی کا مسئلہ ہی ہوتا ہے۔ سماجی مسائل میں رشوت خوری، تعلیم، ازدواجی رشتے، وفاداری، بے وفائی، بدعنوانی، سیاست، مذہب اور مذہبی ٹھیکے داروں کی مکاریاں وغیرہ سماجی مسائل افسانچوں میں بڑی بے باکی سے بیان ہوئے ہیں۔ ہر قلم کار اپنے فن کی پختگی بیان کی گرفت اور اپنی قابلیت کے مطابق مسئلہ کو نشانہ بنا کر سماج کی نبض میں قلم کی نوک پیوست کرنے کی بھر پور کوشش کرتا ہے۔ اگر وہ مکمل افسانچہ ہے تو قلم کار پوری طرح کامیاب ہوتا ہے۔ جو بات ایک طویل افسانے اور ایک طویل ڈرامے میں کہی جاتی ہے وہی بات مختصر سے افسانچے میں کہنا دشوار ضرور ہے لیکن اپنی بات کو قاری کے دل و دماغ تک پہنچانے کا سب سے آسان طریقہ آیا سب سے مختصر راستہ افسانچہ ہی ہے۔ کیوں کہ افسانچے میں طوالت نہیں ہوتی، پیچ وخم نہیں ہوتے۔ سب سے اہم بات وقت برباد نہیں ہوتا نہ ہی قاری کو پیغام کی ترسیل میں دشواری ہوتی ہے۔

ڈاکٹر عظیم راہی 'اردو میں افسانہ نگاری کی روایت' میں رقم طراز ہیں کہ: ''طارق کھولا پوری بھی آج کل 'آتش پارے' کے عنوان سے افسانچے لکھ رہے ہیں۔''

اس سلسلے میں میری ایک تحریر کے جواب میں طارق کھولا پوری لکھتے ہیں:

''ادیب سماج کا ضمیر ہوتا ہے۔ سماج جس کیفیت سے جیسی حالت سے دوچار ہوتا ہے، ادیب اس کیفیت کے کرب کو پوری شدت سے سہہ کر اپنے فن کے سانچے میں ڈھال کر پیش کرتا ہے۔ آج ہماری دنیا نفرت، بغض، عداوت، منافقات اور کرپشن کی آگ میں جل رہی ہے۔ ہمارا سماج اس جہنم کے طبقوں میں بٹ چکا ہے جس جہنم کو خود اس نے دہکایا ہے۔ مجھے اس جہنم سے آتش پارے مل رہے ہیں۔ جسے میں اپنے بے حس سماج کو جو کلچر کے نام پر کی جارہی نا قابلِ برداشت یہودیوں کو خاموش سے سہہ رہا ہے اپنے فن کے سانچے میں ڈھال کر آتش پارے کے عنوان سے انھیں لوٹا رہاہوں۔'' (ایک خط سے اقتباس)

طارق کھولا پوری کے خط کے اس اقتباس کا ہر ایک لفظ چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے کہ اردو افسانچہ زندگی اور اس کے مسائل سے کتنا قریب ہے۔

آیئے اب چند افسانچوں کو زندگی کے مسائل کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ ڈاکٹر عظیم راہی کا ایک افسانچہ ملاحظہ فرمایئے جس کا عنوان ہے 'مداوا'۔

مداوا

وہ اپنا دکھ سناتا بھی تو کیسے! سب اپنے اپنے دکھوں میں مبتلا تھے تو پھر وہ اپنے دکھوں کا مداوا کیسے کرتا۔ آخر وہ خود دوسروں کے دکھوں میں شریک ہو گیا، لیکن یہ کیا۔ اس طرح اس کے اپنے دکھوں کا مداوا ہو گیا۔

اس افسانچے کا کردار دکھ کی گہرائیوں میں ڈوبا ہوا ہے۔ وہ اپنے دکھوں سے نجات پانا چاہتا ہے جس کے لیے وہ اپنے دکھوں کو اوروں سے بانٹنے کی کوشش کرتا ہے تو دیکھتا ہے کہ سارے کے سارے لوگ اپنے دکھوں میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اس لیے وہ سوچتا ہے کہ کیوں نہ میں ان کے دکھ بانٹ لوں اور اس طرح اس کے اپنے دکھوں کا مداوا ہو جاتا ہے۔ یہ تو صرف ایک مثال ہے۔ اس کے علاوہ بھی افسانچے میں زندگی کی بے شمار مسائل پیش کیے جا سکتے ہیں اور پیش کیے جا رہے ہیں۔

اب راقم اپنا ایک افسانچہ پیش کرنا چاہتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

جورو کا غلام

''کیا بات ہے خالہ بہت پریشان دکھائی دے رہی ہو۔''

''پریشان نہیں بیٹا دکھی ہوں۔''

''کس بات پر دکھی ہو خالہ۔''

''ایک بیٹا ہے۔! جو میری ذرا نہیں سنتا.....!! بیوی کے اشاروں پر ناچتا رہتا ہے۔ جورو کا غلام.....!! اللہ سلامت رکھے ایک داماد ہے، جانتی ہوں خوبصورت ہے، لائق ہے، مال دار ہے لیکن میری بیٹی کی ایک نہیں سنتا!!۔''

''یہ تو اچھی بات ہے خالہ.....!!''

''کیا خاک اچھی بات ہے.....!!''

''ارے خالہ تمھاری سمدن تو خوش ہوگی نا کہ اس کا بیٹا جورو کا غلام نہیں ہے۔!!!''

❖❖

یہ افسانچہ حقیقی واقعہ پر مبنی ہے۔ جسے میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور کانوں سے سنا ہے۔ اس حقیقی واقع کو جو سماج کے کئی مسائل میں سے ایک ہے، میں نے افسانچے میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ افسانچہ صرف ایک گھر ایک خاندان یا ایک خوش دامن

کے جذبات کی ترجمانی نہیں کرتا بلکہ میں یہ کہوں تو مبالغہ نہ ہوگا کہ یہ ہر گھر کا مسئلہ ہے اور بھی قلم کار کے سیکڑوں افسانچے ہیں جن میں زندگی پوری آب و تاب کے ساتھ سانسیں لے رہی ہے، جن میں زندگی کے مسائل کی نشان دہی ہو رہی ہے اور کچھ حد تک ان مسائل کے حل بھی بتا دیے جاتے ہیں۔

ہاں آخر میں ایک بات کہنا چاہوں گا کہ میرے مقالے کو سننے یا پڑھنے کے بعد نقاد حضرات کئی ایسی تحریریں پیش کر دیں گے جس میں نہ زندگی ہوگی نہ مسائل ہوں گے۔ تو جناب یہ بھی جان لیجیے کہ وہ افسانچے نہیں ہیں۔ وہ لطیفے، تیرونشتر یا صرف ایک خیال ہے۔ کیوں کہ افسانچے لکھنے کی دوڑ میں کئی قلم کار الٹی سیدھی چار سطریں لکھ کر یہ دعوی کرنے لگتے ہیں کہ یہ افسانچہ ہے۔ کسی بھی تحریر پر افسانچے کا لیبل لگانے سے پہلے ہمیں یہ جان لینا چاہیے کہ وہ افسانچہ ہے یا نہیں۔

آخر میں بس اتنا ہی کہنا چاہوں گا کہ افسانچے میں بھی زندگی بستی ہے اور اس کے ذریعے زندگی کے مسائل بھی ابھر کر سامنے آتے ہیں۔

افسانچہ

(فیفی Fifi)

فرانس زندہ باد

میں نے اپنے منگیتر کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کیے۔ میری پینٹی بستر کے پیچھے گر گئی تھی۔ جب میں اسے اٹھانے گئی تو مجھے وہاں تین پینٹیز ملیں، جن میں میری صرف ایک تھی۔

(انگریزی سے اردو ترجمہ، مترجم: محمد علیم اسماعیل)

افسانچہ نگاری کے خدوخال

محمد فاروق

اُردو میں نظم کی طرح نثر میں بھی بالخصوص فکشن تخلیق کرتے وقت فنی اسرار و رموز کا پاس رکھنا بے حد ضروری ہوتا ہے۔ اس طرح ہم کسی بھی نثر پارے کو اُس وقت تک فکشن کے کسی زمرے میں شامل نہیں کر سکتے جب تک وہ فکشن کے فنی تقاضوں کو پورا نہ کرے۔ فکشن کی مختلف اصناف کے لیے دانشوروں، اہلِ قلم حضرات اور محققین و ناقدین نے کچھ اجزا مقرر کیے ہیں جن کا اُس نثر پارے میں پایا جانا لازم و ملزوم ہے۔

اُردو فکشن کئی صدیوں کا سفر طے کرنے کے بعد داستان، ناول، ناولٹ، افسانہ، مختصر کہانی سے ہوتے ہوئے آج افسانچے تک پہنچ گیا ہے۔ نتیجے کے طور پر سینکڑوں صفحات سے ہوتے ہوئے کہانی چند جملوں میں سمٹ گئی ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ اپنے خیال کو نہایت اختصار کے ساتھ پیش کرنا، ساتھ ہی کہانی میں حسنِ بیان بھی برقرار رکھنا۔ افسانچہ کہلاتا ہے۔ افسانچہ قصہ نگاری کی ایک نئی اور جدید ترین صورت ہے۔ اصل میں افسانچہ افسانے کی ہیئت میں تبدیلی کا تجربہ ہے۔ جس طرح ناول سے ناولٹ نکلا اسی طرح افسانے کے بطن سے افسانچے نے جنم لیا ہے۔

اصل میں افسانچہ، افسانے کا چھوٹا روپ ہے یعنی افسانے میں فکشن نگار کہانی انتہائی اختصار سے پیش کرتا ہے۔ لیکن افسانچہ نگار نے یہ کام اس حسن و خوبی سے انجام دینا ہوتا ہے کہ مختصر افسانچے میں طویل افسانے کا تاثر برقرار رہے۔ بقول محمد بشیر مالیر کوٹلوی:

''جیسے صندوق سے صندوقچہ، کتاب سے کتابچہ اور افسانے سے افسانچہ یعنی افسانے کا چھوٹا سائز، سائز چھوٹا مگر تاثر ویسا ہی جتنا افسانے کا۔'' (افسانہ، افسانچہ تکنیکی تناظر میں۔ص:129)

ڈاکٹر عظیم راہی افسانچے کی تعریف ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

''افسانچہ ادب کی وہ نثری صنف ہے جس میں کم سے کم لفظوں میں کم سے کم سطروں میں ایک طویل کہانی مکمل کرلیں۔ افسانچہ زندگی کے کسی چھوٹے سے لمحے کی تصویر دکھا کر ایک مکمل قاری کے ذہن میں شروع کردینے کا نام ہے۔'' (اردو میں افسانچے کی روایت: تنقیدی مطالعہ۔ص:59)

داستان، ناول اور افسانے کے اجزائے ترکیب غالباً ایک سے ہیں۔ لیکن افسانچے میں کہانی کے سائز کے ساتھ ساتھ اس کے اجزائے ترکیبی میں بھی تبدیلی آئی ہے۔ فکشن کے بہت سے اہم اجزا افسانچہ نگاری میں استعمال نہیں ہوتے، کچھ کا استعمال نہ کے برابر ہوتا ہے۔ اس صنف کے اجزائے ترکیبی کا تعین بہت مشکل ہے۔ لیکن پھر بھی نامور افسانچہ نگاروں اور ناقدین نے افسانچہ نگاری کے لیے مندرجہ ذیل اجزائے ضروری قرار دیے ہیں:

1۔ افسانچے کا سائز
2۔ موضوع
3۔ پلاٹ
4۔ منظر نگاری
5۔ جزئیات نگاری
6۔ کردار نگاری
7۔ مکالمہ نگاری

8۔ نقطہء عروج

9۔ اختتام یا انجام یا کلائمکس

10۔ زبان و بیان

آیئے فکشن کی اس مختصر ترین صنف افسانہ نگاری کے فنی لوازمات اور افسانچہ نگاری کے خدوخال کا جائزہ لیں۔

افسانچے کا سائز:

ظاہر ہے کہ افسانچہ فکشن کی سب سے مختصر ترین صنف ہے۔ مرزا غالبؔ نے ایک خط میں مرزا علی بخش خاں کو لکھا تھا:

> ''چاہتا ہوں کہ کم سے کم لفظوں میں اپنی بات کہہ دوں اور تحریر کو تقریر کا آئینہ بنا دوں۔'' (خطوطِ غالب۔ ص:۵۴)

ایجاد اور اختصار افسانچہ نگاری کا سب سے اہم اور لازمی جز ہے۔ ہم افسانچے کی جسامت اور سائز کو جملوں اور الفاظ میں مقرر نہیں کر سکتے۔ مطلب اشعار کے اوزان اور بحروں کی طرح افسانچے کے لیے لفظوں اور جملوں کی تعداد مقرر نہیں کی جا سکتی۔ کیوں کہ ہر واقعہ کا پلاٹ اور حادثے، ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے، کیوں کہ ہر کہانی میں کردار اور منظر نگاری وغیرہ ایک سی نہیں ہوتی۔ اس لیے نثر کی دوسری اصناف کی مانند افسانچے کی جسامت اور سائز ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ اس ضمن میں فردوس احمد بھٹ رقم طراز ہیں:

> ''افسانچہ مختصر ترین کہانی کو کہتے ہیں جو کم سے کم الفاظ اور کم سے کم سطور میں بیان کی گئی ہو۔ افسانچہ میں کرداروں اور مکالموں کو زیادہ دیکھا نہیں جاتا ہے۔ کیوں کہ افسانچہ کا کینوس بہت ہی چھوٹا ہوتا ہے۔ کہانی چند جملوں میں پیش کی جاتی ہے۔ اس لیے واقعہ کو مختصر ترین صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔''

حالانکہ کچھ افسانچہ نگار، محقق اور مدیر افسانچے کے سائز کی حد کو مقرر کر کے اُسے جملوں کی حد بندی میں قید کرتے ہیں۔اس ضمن میں مشہور فکشن نگار محمد بشیر مالیرکوٹلوی ،افتخار امام [مرحوم] مدیر ماہنامہ ''شاعر'' ممبئی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> '' شاعر بمبئی کے مدیر جناب افتخار امام صدیقی نے افسانچے کا ایک پیمانہ دیا تھا۔ افتخار بھائی ظاہر ہے بہت ذہین انسان ہیں اور خود بھی افسانچے تخلیق کرتے ہیں۔انہوں نے افسانچے کے حروف کا پیمانہ باندھا تھا۔ الف سے لے کر یے تک افسانچے میں سات حروف میں اف س ان چ ہ۔ بڑے سے بڑا افسانچہ سات جملوں کا ہوسکتا ہے۔ بات دل کو لگتی ہے افسانچہ سات لائنوں سے زیادہ اچھا نہیں لگتا میرا ماننا ہے کہ افسانچہ تین جملوں تک محدود ہونا چاہئے۔ استاد منٹو نے منی کہانی کے سائیز کو بھی سیاہ حاشیوں میں شامل کیا ہے۔ وہ اُس وقت کی بات تھی بہر حال افسانچے کا سائیز چھوٹا ہو تو بہتر۔'' (افسانہ، افسانچہ تکنیکی تناظر میں، ص:130)

ان حقائق کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ افسانچے کا سائز چھوٹا ہونا چاہیے۔لیکن ہم اس کے سائز کو الفاظ اور جملوں کی کسی مخصوص حدود میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ہم اب تک شائع شدہ افسانچوں کے مجموعوں کو دیکھیں تو ہمیں دو تین سطروں سے لے کر ایک صفحے تک کے افسانچے دیکھنے کو ملتے ہیں۔اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ افسانچہ ایک صفحہ سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔

البتہ کچھ لوگوں نے ماہنامہ 'شاعر' ممبئی میں یک لفظی افسانچے بھی لکھے تھے۔جن کی سخت تنقید ہوئی ۔مثال کے طور پر اردو کے چند کامیاب افسانچے پیش کیے جا رہے ہیں۔جس سے آپ کو افسانچے کی جسامت کا اندازہ ہو جائے گا۔

سوری

''چھری پیٹ چاک کرتی ہوئی ناف کے نیچے تک چلی گئی۔آزار بند کٹ گیا۔چھری مارنے والے کے مُنہ سے اچانک کلمۂ تاسف نکلا۔ چ...چ...چ...چ...مشٹیک ہوگیا۔''(افسانچہ نگار سعادت حسن منٹو)

مجرم

میری بیٹی ٹرین کے باتھ روم سے واپس آتے ہی مجھ سے بولی۔
''پاپا...! آپ ابھی تک غلط ہندی لکھتے ہو اور میں...دوہری شرم میں ڈوب گیا۔(افسانچہ نگار،ایم اے حق)

محلّے کے بچے

اُس کے بچّوں سے سارا محلّہ پریشان تھا۔
اُس نے تنگ آکر اپنے بچّوں کو دینی مدرسے میں ڈال دیا۔
وہ فارغ ہوکر لوٹے تو سارا شہر پریشان ہے۔(افسانچہ نگار، عارف خورشید)

موضوع:

افسانچہ نگاری میں موضوع کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ہم روزانہ بہت سی فضول باتیں کرتے ہیں لوگ اُن کو بے توجہی سے سنتے ہیں کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ہم اگر کوئی عجیب وغریب بات کریں گے، سنسنی خیز واقعہ سنائیں گے تو لوگ اپنا کام چھوڑ کر ہماری بات سنیں گے اور اُس بات پر ہمارے بعد بھی بحث و مباحثہ کریں گے۔بس افسانچہ کا موضوع بھی ایسا ہی ہو کہ جو اُسے پڑھنے لگے اور پورا پڑھ کر ہی دم لے۔پھر پڑھنے کے بعد

اپنے دوستوں سے اس کے متعلق تذکرہ کرے۔

کامیاب افسانچے کی ضمانت منفرد موضوع ہوتا ہے۔افسانچے کا موضوع اچھوتا ہونے کے ساتھ ساتھ منفرد ہونا چاہئیے، پرانے اور گھسے پٹے موضوعات پر لکھے افسانچے کامیاب افسانچوں میں شمار نہیں ہوتے۔اس ضمن میں ایم۔اے۔حق میں رقم طراز ہیں:

''افسانے کا موضوع دورِ حاضر کے مسائل اور اُس کی اِردگرد گردش کرنے والے حالاتِ زندگی کا عکس ہونا چاہئیے ۔گِھسے پِٹے واقعات یا تفصیلات یا ٹاپک سے بچنا چاہیے۔'' (افسانچہ نگاری کا فن۔ص:18)

افسانچے میں موضوع کے نئے پن کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے محمد بشیر مالیر کوٹلوی کچھ یوں لکھتے ہیں:

''موضوع عام یا گوروٹین کی بات ہو اُس کی پیش کش،ایک ایسے پہلو کی پیش کش جس پر کسی کی نظر نہ گئی ہو۔اُس کو شاہ کار بنا دیتے ہیں۔موضوع افسانچے کی روح ہے اور روح کے بغیر انسان لاش کہلاتا ہے۔'' (افسانہ،افسانچہ تکنیکی تناظر میں۔ص:122)

اس کے ساتھ ہی حکایت، لطیفے اور اقوال زریں کو افسانچے کی شکل دینے سے پرہیز کرنا بے حد ضروری ہے۔کیوں کہ یہ سبھی اصناف افسانچے کے فنی اصول پر کھری نہیں اترتیں۔لیکن بہت سے محققین و ناقدین نے خلیل جبران،ابراہیم جلیس اور شیخ سعدیؒ کی تحریروں کو افسانچے کی صف میں کھڑا کر دیا ہے۔ان قلم کاروں کی یہ تحریریں افسانچہ نگاری کے ضمن میں شامل نہیں کی جاسکتیں کیوں کہ ان میں افسانچہ نگاری کی خوبیاں نہیں ہیں۔

اردو افسانچہ اپنے ادبی سفر کے غالباً 70۔72 سال پورے کر چکا ہے اور آج ہر طرح کے موضوعات پر افسانچے لکھے جا رہے ہیں۔جن میں قومی و بین الاقوامی سیاسی، سماجی،

مذہبی اور اخلاقی موضوعات وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ان حقائق کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ افسانچہ نگاری کی پہلی شرط یہ ہے کہ موضوع دھماکے دار، اچھوتا اور چونکا دینے ہو۔

پلاٹ:

افسانچہ فکشن کی ننھی سی صنف ہے جو چند جملوں پر مشتمل ہوتا ہے۔اس لیے اس میں پلاٹ کی زیادہ اہمیت نہیں ہوتی۔اس کے علاوہ افسانچے میں افسانے کی مانند زیادہ واقعات بھی نہیں ہوتے۔لہٰذا افسانچے میں قلم کار کو چند جملوں میں ایک طویل کہانی کو پیش کرنا ہوتا ہے لیکن یاد رہے کہ اس چند جملوں کی کہانی میں طویل کہانی کا تاثر پوشیدہ ہونا چاہیے۔قاری کو اس چھوٹی سی کہانی کو پڑھ کر کسی طرح کی تشنگی محسوس نہیں ہونی چاہیے۔ بلکہ اُسے بھرپور کہانی کا مزہ آنا چاہیے۔اس ضمن میں مشہور و معروف فکشن نگار جوگیندر پال لکھتے ہیں:

> ''منی افسانے کا کمال یہ ہوتا ہے کہ چند ہی سطروں میں قاری ایک طویل کہانی کا تانا بانا آپ ہی اپنے ذہن میں بُن لے۔''
> (اردو میں افسانچہ کی روایت:تنقیدی مطالعہ۔ص:49)

اصل میں افسانچہ کم سے کم لفظوں میں ایک طویل کہانی کی وحدت کا نام ہے۔مطلب یہ کہ کم سے کم لفظوں میں لکھا گیا یہ افسانچہ خود بخود ہی قاری کے ذہن میں پھیل کر ایک طویل کہانی بن جائے۔ بہت سے افسانچے کے ناقدین کے مطابق ایک اچھا افسانہ نگار ہی ایک اچھا افسانچہ لکھ سکتا ہے۔کیوں کہ افسانچہ، افسانے کی چھوٹی شکل ہے۔اس حوالے سے معروف افسانہ نگار و افسانچہ نگار محمد بشیر مالیر کوٹلوی رقم طراز ہیں:

> ''ایک کامیاب افسانہ نگار ہی بہتر افسانچہ تخلیق کر سکتا ہے۔''
> (افسانہ،افسانچہ تکنیکی تناظر میں۔ص:133)

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ جو افسانچہ نگار، افسانے کی تکنیک اور لوازمات سے

ناواقف ہو وہ اچھا افسانچہ نہیں لکھ سکتا۔ اس سلسلہ میں عبدالرحیم نشتر کچھ یوں رقم طراز ہیں:

> ''افسانچہ وہی قلم کار لکھ سکتا ہے جس نے افسانہ کے رموز واسرار کو بہتر طریقے سے جانا، پرکھا اور برتا ہو۔ منی افسانہ نگاری انگلی سے پربت اُٹھانے کا فن ہے۔'' (ودربھ میں اردو افسانہ۔ ص:13)

بہت سے ناقدین کے مطابق افسانہ نگاری سے افسانچہ نگاری کہیں مشکل کام ہے۔ اصل میں افسانہ نگار کے پاس اپنی تخلیق کو خوب صورت بنانے کے بہت سے اوزار ہوتے ہیں۔ مثلاً حسب ضرورت کردار، کردار کے مزاج کے مطابق مکالمے، شعریت سے بھرپور منظر نگاری، جذبات نگاری اور جزیات نگاری وغیرہ وغیرہ۔ جب کہ اس کے مقابلے میں افسانچہ نگار کے پاس اوزار نہیں ہوتے۔ اُسے کم سے کم الفاظ میں ہی طویل کہانی کا تاثر پیدا کرنا ہوتا ہے۔ افسانچے کے اختتام پر دھماکہ کرنا ہوتا ہے۔ چونکا دینے والی کیفیت پیدا کرنا ہوتی ہے۔

منظر نگاری:

صدیوں سے منظر نگاری فکشن کا ایک اہم جز رہی ہے۔ منظر نگاری کے ذریعے ہی کوئی فن کار قاری کے ذہن میں اپنی تخلیقی کائنات بساتا ہے یعنی وہ منظر نگاری کی مدد سے ہی اپنے قاری کو اپنی تخلیق کا حصّہ بناتا ہے۔ جس کے نتیجے میں کہانی اُس کے ذہن میں فلم کی طرح چلنے لگتی ہے۔ لیکن افسانچہ چوں کہ بے حد مختصر ہوتا ہے کئی بار چند سطروں پر ہی مبنی ہوتا ہے۔ اس وجہ سے منظر نگاری ایسے افسانچوں کا حصّہ نہیں بنتی۔ لیکن پانچ دس سطروں یا اس سے زیادہ جملوں کے افسانچوں میں منظر نگاری کا عکس ضرور نظر آتا ہے۔

جزئیات نگاری:

ایک زمانہ تھا جب فکشن تفریح کا سب سے اہم وسیلہ تھا۔ ادب تفریح کا سب سے بڑا ذریعہ مانا جاتا تھا۔ لوگ طویل تحریریں پڑھنے کے عادی تھے۔ اُس دور کا فکشن نگار بھی اپنی

تحریروں کو جزئیات نگاری کی مدد سے بڑھاتا رہتا تھا۔ وہ اپنی تحریر کے اصل موضوع کے علاوہ دوسرے غیر ضروری واقعات کو بھی اپنی تخلیق کا حصہ بناتا رہتا تھا۔ مثلاً راجندر سنگھ بیدی نے اپنی تمام تخلیقات میں اپنے موضوع کے علاوہ پنجابی کلچر کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ اسی طرح منشی پریم چند نے یوپی کے جاگیردار نظام کو مکمل نقشہ اپنی تحریروں میں پیش کیا ہے۔

لیکن افسانچہ چوں کہ ایک بھی زائد جملہ تو کیا ایک حرف کا بھی بوجھ برداشت نہیں کرسکتا۔ اس لیے افسانچہ نگاری میں جزئیات نگاری کا استعمال نہیں ہوتا۔ نتیجے کے طور پر فکشن کا ایک بہت اہم جز افسانچہ نگاری سے خارج ہوگیا ہے۔

کردار نگاری:

فکشن کی دوسری اصناف کی مانند کردار نگاری بھی افسانچہ نگاری کا بہت اہم جز ہے۔ لیکن داستان، ناول اور افسانہ نگاری کے برعکس افسانچے میں کرداروں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔ اکثر افسانچوں میں ایک دو کردار ہوتے ہیں۔

عموماً دیکھنے میں آیا ہے کہ بہت کم افسانچہ نگار اپنے کرداروں کو نام دیتے ہیں۔ وہ کرداروں کے نام کے بجائے اسم ضمیر سے انہیں مخاطب کرتے ہیں۔ مثلاً میں، وہ، اُس، ہم اور انھیں وغیرہ۔ افسانچہ نگاری میں کردار نگاری کے متعلق فردوس احمد بٹ کچھ یوں رقم طراز ہیں:

> ''کردار کم سے کم ایک یا دو ہوتے ہیں۔ کرداروں کے نام کی بجائے اکثر ضمیر سے کام لیا جاتا ہے جیسے وہ، ہم، اس اور میں وغیرہ۔'' (ڈاکٹر عظیم راہی بحثیت افسانچہ نگار۔ ص:26)

سعادت حسن منٹو کا ایک افسانچہ ''کرامات'' اس ضمن میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس افسانچے میں منٹو نے اپنے کرداروں کو نام نہیں دیئے۔ بلکہ اسمِ ضمیر کی مدد سے افسانچے کا تانا بانا تیار کیا ہے۔

کرامات

لوٹا ہوا مال برآمد کرنے کے لیے پولیس نے چھاپے مارنے
شروع کیے۔ لوگ لوٹا ہوا مال رات کے اندھیرے میں باہر پھینکنے
لگے۔ کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے اپنا مال موقع پا کر اپنے سے
علیحدہ کر دیا تا کہ قانونی گرفت سے بچے رہیں۔ ایک آدمی کو
بہت دقت پیش آئی۔ اس کے پاس شکر کی دو بوریاں تھیں۔ جو
اس نے پنساری کی دکان سے لوٹی تھیں۔ ایک تو وہ جوں کی توں
رات کے اندھیرے میں پاس والے کنویں میں پھینک آیا۔ لیکن
جب دوسری اس میں ڈالنے لگا۔ تو خود بھی ساتھ چلا گیا۔
شور سن کر لوگ اکھٹے ہو گئے کنویں میں رسیاں ڈالی گئیں۔ دو
نو جوان نیچے اُترے اور اس آدمی کو باہر نکال لیا۔ لیکن چند گھنٹوں
کے بعد وہ مر گیا۔ دوسرے دن جب لوگوں نے استعمال کے
لیے پانی نکالا تو وہ میٹھا تھا۔ اس رات اس آدمی کی قبر پر دیئے
جل رہے تھے۔

اسی طرح رتن سنگھ نے بھی اپنے افسانچوں کے مجموعے ''مانک موتی'' میں اپنے کرداروں کو نام دینے کی بجائے اسمِ ضمیر کے ذریعے پیش کیا ہے۔

جوگیندر پال کے افسانچوں کے مجموعے ''نہیں رحمان بابو...!'' کے سبھی افسانچوں کا ایک ہی کردار رحمان بابو ہے۔ افسانچہ نگار اس مجموعے کے سبھی افسانچوں میں رحمان بابو سے محوِ گفتگو ہے۔ ایک افسانچہ ملاحظہ فرمائیں:

میرے کلینک میں آج ایک روبو (روبوٹ) آنکلا، رحمٰن بابو،
چیک اَپ کے بعد میں نے اُسے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ
بتانے لگا، تھکا تھکا سا رہنے لگا ہوں، ڈاکٹر اور اُس کی شکایت سُن

کر مجھے یہ فکر لاحق ہونے لگی کہ کہیں اُس میں جان تو نہیں پڑ گئی۔

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ افسانچہ نگاری میں زیادہ کرداروں کی بھرمار سے پرہیز کرنا چاہیے۔اس سے قاری کو افسانچہ سمجھنے میں الجھن ہوتی ہے۔اس کے ساتھ ہی کہانی کا خیال بھی متاثر ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ بہت سے افسانچے بیانیہ انداز میں لکھے جاتے ہیں۔جن میں افسانچہ نگار خود ہی کہانی بیان کرتا ہے۔ایسے افسانچوں میں ایک بھی کردار نہیں ہوتا۔''سیاہ حاشیے'' کا بیانیہ انداز میں لکھا ایک افسانچہ ملاحظہ فرمائیں:

دعوت عمل

آگ لگی تو سارا محلّہ جل گیا۔صرف ایک دوکان بچی جس کی پیشانی پر یہ بورڈ آویزاں تھا۔یہاں عمارت سازی کا جملہ سامان ملتا ہے۔

مکالمہ نگاری:

اردو افسانچہ نگاری کے مطالعہ کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے یہاں دوطرح کے افسانچے لکھے جاتے ہیں۔پہلی قسم کے افسانچے بیانیہ افسانچے ہیں۔جن میں افسانچہ نگار کہانی اپنی زبانی پیش کرتا ہے۔

ایسے افسانچوں میں کوئی کردار نہیں ہوتا۔جب کردار نہیں ہوتے تو مکالمے کون ادا کرے گا۔اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ بیانیہ کی تکنیک میں لکھے گئے افسانچوں میں مکالمے نہیں ہوتے۔مثال کے طور پر جوگیندر پال کی بیانیہ کی تکنیک میں لکھا ایک افسانچہ ''کہانی'' ملاحظہ فرمائیں:

کھانی

میں نے ندی کا پیچھا کرنا چاہا، مگر کیسے کرتا؟
وہ تو بہ یک وقت اپنے آگے بھی تھی اور پیچھے بھی!
سو میں بھی لاچار سا اسے چپ چاپ دیکھتا رہ گیا۔(افسانچے
''پرندے''۔ص:17)

دوسری قسم کے افسانچے وہ ہوتے ہیں جن میں زندہ جاوید کردار ہوتے ہیں۔ جو اپنے احساسات، جذبات اور مسائل کو بیان کرنے کے لیے اپنی مادری زبان میں مکالمے ادا کرتے ہیں۔ لیکن فکشن کی دوسری اصناف کے برعکس افسانچہ نگار میں کرداروں کے منہ سے ادا ہونے والے مکالمے مختصر ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر محمد بشیر مالیرکوٹلوی کا ایک افسانچہ''وارننگ''پیش خدمت ہے:

وارننگ

''یہ کیا کیا تم نے.....!؟.....داڑھی رکھ لی.....!؟''
''ہاں بھئی داڑھی رکھنا۔سنت ہے....اور ثواب بھی...''
''یہ شرعی معاملہ ہے۔میاں.... یہاں اگر مگر کی گنجائش نہیں....''
''لیکن.....؟...آپ جہاں جاؤ، اپنا آئی کارڈ جیب میں رکھ
لینا.....''   (افسانہ، افسانچہ تکنیکی تناظر میں۔ص120)

مکالمہ نگاری ایک مشکل فن ہے۔جو بہت ریاضت کے بعد نصیب ہوتا ہے۔اصل میں مکالمے لکھنے کے لیے افسانچہ نگار کو اپنے کردار کا بغور مطالعہ کرنا پڑھتا ہے۔تبھی وہ اپنے کردار کی زبان سے حقیقی جملے ادا کروا سکتا ہے۔لیکن افسانچہ نگاری میں کیوں کہ اختصار سے کام لیا جاتا ہے۔اس لیے افسانچہ نگار کو چاہیے کہ وہ اپنے کرداروں سے چھوٹے جملے ادا کروائے۔افسانچے کے مکالمے چست اور مختصر ہونے چاہئیں۔

نقطۂ عروج:

نقطۂ عروج افسانچہ نگاری کا بے حد اہم جز ہے۔ کسی بھی افسانچے کی کامیابی اس کے نقطۂ عروج پر منحصر ہوتی ہے۔ افسانچے کا عروج بے حد مؤثر اور جان دار ہونا چاہیے تا کہ قاری کے دل و دماغ پر گہرا ہو یعنی وہ افسانچے کی پیش کاری اور افسانچہ نگار کے خیال سے متاثر ہو۔

اصل میں افسانچہ نگاری میں افسانچہ نگار کو اپنے خیال کو اس انداز سے پیش کرنا ہوتا ہے کہ قاری سوچنے پر مجبور ہو جائے۔ مختصر کہانی میں نقطہ ءعروج کی اہمیت کو مشہور و معروف قلم کار اظہار اثر کچھ یوں واضح کرتے ہیں:

> ''مختصر کہانی صرف بات کہنے سے نہیں بنتی بلکہ نقطۂ عروج ایسا ہونا چاہیے کہ تخلیق کار کی بات قاری کے دل میں تیر کی طرح اترتی چلی جائے۔'' (ماہنامہ ''گونج'' حیدر آباد۔ رحیم انور نمبر۔ ستمبر 1996)

افسانچہ احساس، افسانویت اور تاثر جیسے اجزاء کا مرکب ہے۔ یعنی جس افسانچے میں یہ اجزاء پائے جائیں گے وہی افسانچہ کامیاب مانا جائے گا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر مجید بیدار رقم طراز ہیں:

> ''جس طرح بم عناصر الیکٹرو، پروٹو اور نیوٹران سے مل کر بنتا ہے اور ایک بڑے دھماکے کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ اسی طرح افسانہ احساس افسانویت اور تاثر سے مرکب ہے۔ جب مناسب انداز سے مخلوط ہو جانا دھماکہ ثابت ہوتا ہے۔ بم کا دھماکہ زمین یا فضا میں ہوتا ہے چنانچہ افسانہ کا دھماکہ قاری کے ذہن اور سوچ کے ماحول پر اثر انداز ہوتا ہے۔'' (اُردو میں افسانچہ کی روایت، ص ۴۶)

ان حقائق کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ نقطۂ عروج افسانچے کا وہ حصّہ ہے جو

افسانچے کے آغاز اور اختتام کو آپس میں جوڑتا ہے۔ اگر کسی افسانچے کا یہ درمیانی پہلو ڈھیلا ہوگا تو قاری اختتام پر پہنچنے سے ہی پہلے ہی اوب جائے گا۔ اس لیے افسانچہ نگاری میں نقطۂ عروج کی بہت اہمیت ہے۔

اختتام یا انجام یا کلائمکس:

فکشن کی دوسری اصناف کی مانند افسانچے کے آخری جملوں کو اختتام یا انجام یا کلائمکس کا نام دیا جاتا ہے۔ افسانے سپاٹ اور اینٹی کلائمکس بھی لکھے گئے ہیں یا لکھے جا رہے ہیں یعنی ایسے افسانے جن کا انجام افسانہ پڑھتے پڑھتے ہی قاری پر کھل جاتا ہے جس کے نتیجے میں قاری کی افسانے میں دلچسپی کم ہو جاتی ہے جب کہ افسانچے میں کلائمکس کا چونکا دینے والا ہونا بے حد ضروری ہے۔ بلکہ افسانچے کا کلائمکس بم کی طرح پھٹنا چاہیے اور قاری افسانچے کے اختتام پر پوری طرح چونک جائے۔ اس کے علاوہ افسانچے کا تانا بانا ایسے بُنا جائے کہ قاری افسانچے کے دوران ہی اختتام پر نہ پہنچ سکے۔ افسانچے کے کلائمکس کے متعلق مشہور افسانہ نگار و افسانچہ نگار م۔ ناگ لکھتے ہیں:

> ''منی افسانہ کسی حادثے کا فوری ردِعمل ہے اس میں نقطۂ عروج کے بعد سیدھے انجام جگہ پاتا ہے اور انجام چونکا دینے والا جھٹکا دینے والا اور کچھ سوچنے پر مجبور کرنے والا ہونا چاہیے۔'' (اُردو میں افسانچہ کی روایت۔ص:47)

افسانچہ تخلیق کرتے ہوئے اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ تخلیق کار بیان سے موضوع کی گرہ نہ کھل جائے۔ وہ کیا کہنا چاہتا ہے..؟ کیوں کہنا چاہتا ہے.....؟ اگر یہ راز قاری پر کھل گیا تو افسانچے کا تجسّس جاتا رہے گا۔ تجسّس افسانچے کی خوب صورتی اور کشش میں اضافہ کرتا ہے۔

قاری بڑے انہماک سے مطالعہ میں غرق ہونا چاہیے اور اُس کے ذہن میں یہی

سوالات افسانچے کے اختتام تک گونجیں کہ اب کیا ہوگا...؟ آگے کیا ہوگا...؟ آگے کیا ہونے والا ہے...!؟اس کے بعد کیا ہوگا...؟ان سوالات کو ہی ہم تجسّس کا نام دیتے ہیں۔اس کو ہم سسپنس بھی کہہ سکتے ہیں۔ اگران سوالات کا حل قاری نے اختتام سے پہلے ڈھونڈ لیا تو سمجھوافسانچے میں تجسّس نہیں رہااور قاری کی دلچسپی کم ہوتی جائے گی۔اس لیے ضروری ہے کہ افسانچے میں اختتام تک تجسّس قائم رکھنے کی کوشش کی جائے۔ظاہر ہے تجسّس آپ کے اسلوب کی خوب صورتی ہے۔

ان حقائق کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ افسانچہ نقطۂ عروج سے سیدھا انجام کو پہنچتا ہے۔اس لیے افسانچے کا انجام چونکا دینے والا ہونا چاہیے بلکہ قاری کے ذہن میں افسانچے کا جو اختتام ہواس کے برعکس ہونا چاہیے۔اس سے قاری کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے

مختصر یہ کہ کسی بھی خیال کو کم سے کم الفاظ میں بیان کر دینے کے ساتھ ہی اختتام پر قاری کا چونکنا اور متاثر ہونا لازمی ہے۔ورنہ افسانچہ،افسانچہ نہ ہوکر ایک واقعہ بن جاتا ہے۔

زبان و بیان :

زبان و بیان ایک ایسی اصطلاح ہے۔ جو دومختلف الفاظ زبان اور بیان کا مرکب ہے۔ یہاں پر زبان سے مراد تخلیق کے الفاظ سے ہے اور بیان سے مراد تخلیق کار کے اسلوب سے ہے یعنی فکشن نگار کے تخلیق کی پیش کاری سے ہے۔

فکشن کی کوئی بھی صنف ہو۔قلم کار کا کہانی کی زبان و بیان پر عبور ہونا بے حد ضروری ہے۔ کیونکہ زبان و بیان کی خوبصورتی ہی کسی تحریر کو دلچسپ اور خوبصورت بناتی ہے۔تخلیق کار کا منفرد اسلوب ہی قاری کو تخلیق کے ساتھ جوڑے رکھتا ہے۔

زبان کی شگفتگی ،سادگی اور مٹھاس کسی بھی تحریر کو موثر اور قابلِ قبول بناتی ہے۔ الفاظ کا استعمال سلیقے سے کرنا ،بجا لفاظی اور بھاری بھرکم الفاظ کے استعمال سے پرہیز اور مشکل محاوروں اور تشبیہات کے استعمال سے بچنا چاہیئے ۔کیونکہ یہ سبھی چیزیں کسی بھی تحریر کو بھوجھل اور کھردارا بناتیں ہیں۔جس کی وجہ سے مطالعے کے دوران قاری کا

تحریر سے بار بار تسلسل ٹوٹتا ہے نتیجے کے طور پر قاری اوب جاتا ہے۔

افسانچے میں الفاظ کا استعمال اور بھی مشکل ہے۔ کیونکہ افسانچہ ایک بھی زائد حرف برداشت نہیں کرسکتا۔ افسانچے میں افسانچہ نگار کو الفاظ اس طرح جڑنے ہوتے ہیں جیسے سونے کے زیور میں موتی۔ اس کے علاوہ افسانچے کی عمارت بہت چھوٹی ہوتی ہے۔ اس لیے اس صنف میں الفاظ کا استعمال اور بھی احتیاط سے کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں معروف نقاد سلیمان اطہر جاوید لکھتے ہیں:

> ''افسانچے اسی وقت نکھرتے ہیں اور کامیاب ہوتے ہیں جب افسانچہ نگار لفظوں کی قدر و قیمت، ان کی معنوی تہ داری اور ان کے درون کے اسرار سے واقف ہو اور کفایت لفظی کا ہُنر جانتا ہو کہ کم از کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ کہنے پر قادر ہو۔ گویا لفظ کو گنجینۂ معنی کا طلسم بنادے۔ زبان کا تخلیقی استعمال ہو تو اور کیا چاہیے۔''(ماہنامہ ''توازن'' مئی تا دسمبر ۲۰۰۱ء، ص ۳۶۔۳۷)

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک بہترین، منفرد اور کامیاب افسانچہ لکھنے کے لیے تخلیق کار کا زبان و بیان پر عبور بے حد ضروری ہے۔ کیونکہ افسانچے کی خوبصورتی اس کے زبان و بیان پر ہی منحصر کرتی ہے۔

ضروری ہدایات:

ان حقائق کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ افسانچہ نگاری فکشن کی جدید ترین صنف ہے۔ جو اپنے ادبی سفر کی سات دہائیاں پار کرچکی ہے۔ اس طرح افسانچہ نگاری اپنے ابتدائی سفر کی منزلیں طے کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے۔ اخبار و رسائل نے بھی اس مختصر صنف کا خیر مقدم کیا ہے۔ اب بیشتر اخبارات کے ادبی ایڈیشنوں میں افسانچے ہی شائع ہوتے ہیں۔ کثیر تعداد میں افسانچوں کے مجموعے شائع ہو رہے ہیں۔ لیکن ان افسانچوں کے

مجموعوں کے مطالعے کے بعد یہ بات محسوس کی گئی ہے کہ بہت سے افسانچہ نگار اب بھی لطیفوں، آزاد نظموں، اقوال زریں اور حکایتوں کو افسانچے کا روپ دے رہے ہیں۔ یہاں پر یہ بات واضح رہنا بے حد ضروری ہے کہ افسانچہ نگاری ایک منفرد صنف ہے۔ جس میں مندرجہ ذیل شرائط کا پاس رکھنا لازمی ہے۔

1۔ افسانچے میں اپنے خیالات، احساسات اور جذبات کو کم سے کم لفظوں یا جملوں میں بیان کرنا چاہئے۔

2۔ افسانچہ کا موضوع منفرد، اچھوتا اور نیا ہونا چاہیے۔ پرانے اور گھسے پٹے موضوعات پر لکھے افسانچے قاری کو متاثر نہیں کرتے۔

3۔ افسانچہ میں پلاٹ کی زیادہ اہمیت نہیں ہوتی لیکن پھر بھی اس مختصر نثر پارے میں طویل کہانی کا تاثر پوشیدہ ہونا چاہیے۔

4۔ طویل منظر نگاری کو افسانچہ برداشت نہیں کرتا۔ لہٰذا اگر افسانچہ نگار کو منظر نگاری کی ضرورت محسوس ہو تو اختصار سے کام لیا جائے۔

5۔ افسانچے میں کرداروں کی بھرمار نہیں ہوتی۔ عموماً افسانچے میں ایک یا دو کردار ہی ہوتے ہیں۔

6۔ مکالمہ نگاری بھی افسانچہ نگاری کا اہم جز ہے۔ لیکن افسانچے کے کرداروں کے منہ سے ادا ہونے والے مکالمے مختصر، جامع اور چست ہونے چاہئیں۔

7۔ نقطۂ عروج افسانچہ نگار کا بہت ہی اہم جز ہے۔ نقطۂ عروج جان دار اور شان دار ہونا چاہیے۔

8۔ افسانچے کا اختتام چونکا دینے والا اور جھٹکا دینے والا اور سوچنے پر مجبور کرنے والا ہونا چاہیے۔

افسانچے کافن اور اقتباسات

جوگندر پال:

افسانچے کی سب سے نمایاں خوبی یہ ہے کہ ایک چپ ہی چپ میں ساری بات ہو لیتی ہے اور قاری اسے پڑھ کر گویا افسانچہ نگار کو سمجھانے لگتا ہے...نہیں، آپ کی کہانی یہ بیان نہیں کر رہی ہے جو آپ بتا رہے ہیں۔ بیٹھیے، میں آپ کو سمجھاتا ہوں۔آپ کی کہانی دراصل یہ کہ رہی ہے کہ...اور افسانچہ نگار قاری کو بغور سن کر بڑی طمانیت سے جواب دیتا ہے... ہاں! واقعی، یہی تو!...افسانچے کے اختصار اہم ترین پہلو یہی ہے کہ اس کے معانی افسانچہ نگار کے دوٹوک فیصلے کی بجائے قاری کے تخلیقی تجسّس سے انجام پاتے ہیں۔

ڈاکٹر رضوان احمد:

افسانچہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ دل کش شعر کی طرح ذہن سے چپک کر رہ جاتا ہے۔جس طرح غزل کا شعر ذہن و دل میں اتر کر بہت عرصہ تک کچوٹتا رہتا ہے اسی طرح سے افسانچہ بھی ذہن میں جاگزیں ہوجاتا ہے اور بار بار قاری کو اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے۔اس طرح کے کئی افسانچے مجھے یاد ہیں۔

عبداللہ جاوید (کینیڈا):

افسانچہ اپنے نام کی نسبت سے ایسے افسانے کو کہا جاتا ہے جو بے حد مختصر ہو لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ دنیائے ادب میں افسانچہ اس زمانے (آج سے ہزاروں برس

پہلے) سے موجود ہے جب افسانے کا نام ونشان بھی نہیں تھا۔ یونانی ادب میں ایسوپ AESOP کی کہانیاں فیبلس FABLES ملتی ہیں جو ایک یونانی غلام تھا۔ یہ دراصل ایسے افسانچے، مختصر کہانیاں تھیں جو کسی اخلاقی درس پر منتج ہوتی تھیں۔ ان میں دانش اور آموزش کسی دل چسپ کہانی کی صورت میں پیش کی گئی ہوتی تھی۔ ایسوپ کی کہانیاں دنیا کی ہر قابل ذکر زبان میں آج بھی مقبول خواص وعوام ہیں۔ عربی زبان میں ایسی مختصر حکایات مل جاتی ہیں جو زندگی کے دانش ورانہ مشاہدے کا نچوڑ ہیں ان میں طنز ومزاح کے عناصر بھی ملتے ہیں۔ فارسی میں حکایات سعدی اسی انداز کی ہیں۔ مثنوی مولانا روم میں بھی ایسی مختصر تمثیلیں موجود ہیں۔ بیشتر سریانی زبانوں بلکہ سارے مغربی ادب میں ایسوپ کی حکایات کے علاوہ بھی اس قبیل کی حکایات اور تمثیلیں موجود ہیں۔ ہندوستان میں بھی خاص طور پر بدھسٹ فکر سے مربوط مختصر کہانیوں کا ایک بڑا ذخیرہ ملتا ہے۔

دیپک بدکی:

افسانے کی روایت کوئی زیادہ پرانی نہیں ہے تاہم ان سوسوا سو سالوں میں خاص طور پر دور جدید میں اس صنف میں کئی تجربے ہوئے پلاٹ، مکالموں، کرداروں، کلائمکس اور ہیئت میں تبدیلیاں کی گئیں۔ کچھ بامعنی اور کچھ بے معنی۔ جدید افسانہ نگاروں نے ایک جانب کہانی سے کہانی پن چھین لیا اور دوسری جانب مغربی افسانہ نگاروں کی تقلید میں اس زعم کو پالنے لگے کہ قارئین کے پاس پڑھنے کے لیے وقت نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے مغربی قارئین کے بارے میں یہ بات صحیح ہو مگر ہمارے ملک میں ابھی تک ایسا کوئی انقلاب نہیں آیا جس کے باعث قارئین عدیم الفرصت ہو گئے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ رسالوں کے مدیران نے دانستہ طور پر اس نہج کو ترویج دی کیوں کہ اس طرح وہ زیادہ سے زیاد قلم کاروں کو اپنے رسالوں میں جگہ دے سکتے تھے۔ خیر مدعا جو بھی رہا ہو منی افسانہ یا افسانچہ اب ایک حقیقت بن چکا ہے اور اس صنف نے اپنی الگ پہچان بنائی ہے۔

ڈاکٹر کیول دھیر:

مختصر کہانی لکھنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ ایک واقعہ، ایک خیال ،ایک لمحہ، ایک جذبہ پیدا ہوتا ہے جو ذہن میں سماتے ہی شدّت اختیار کر لیتا ہے۔ کہانی کار اسے جب کہانی کا روپ دیتا ہے تو اُس کی ذہنی سوچ اسی تیز رفتاری اور شدّت کے ساتھ کردار کی انگلی تھامے قلم کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ مختصر کہانی کا جنم شدید ردِ عمل، گہری سوچ اور جذباتی شدّت سے ہوتا ہے۔ اختصار کی تکنیک اگر قلم کار کے پاس موجود ہو تو کردار ننھی منی کہانی میں ڈھل جاتا ہے۔

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی:

اردو میں افسانہ نگاروں کی بھیڑ ہے۔ لیکن تیز رفتار زندگی اور الیکٹرونک میڈیا کی کشش کی وجہ سے افسانہ کے قاری سمٹتے جا رہے ہیں۔ ایسے میں افسانچہ پر توجہ مرکوز ہو رہی ہے اور افسانچہ نگاروں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔

امجد مرزا امجد﴿ لندن﴾:

ایک زمانہ تھا جب ناول افسانے کہانیاں شوق سے پڑھی جاتی تھیں۔ رات کو نانی، دادی بچوں کو گود میں لے کر کہانیاں سنایا کرتی تھی۔ بچپن میں ہم خود والدین سے ضد کر کے کہانیاں سنا کرتے تھے۔ اس صدیوں پرانی روایت کو آہستہ آہستہ پہلے ریڈیو پر نشر ہونے والے ڈراموں نے چاٹنا شروع کر دیا اور پھر رہی سہی کسر ٹیلی ویژن نے نکال دیں۔ اب اکثر گھروں کی یہ حالت ہے کہ کھانے کے دوران بھی ٹی وی پر ڈرامے اور فلمیں دیکھی جا رہی ہیں اور رات گئے تک یہی حالت رہتی ہے۔ کتاب پڑھنا تو درکنار کسی کا آنا جانا تک مفقود ہو چکا ہے۔ بڑے شہروں میں تو یہاں تک دیکھا گیا ہے کہ شادیاں رات گئے شروع ہوتی ہیں کہ پہلے انھیں ڈراموں کی دو قسطیں دیکھنی ہوتی ہیں جو کئی سال شیطان کی آنت

کی طرح ختم ہونے میں نہیں آتیں۔

ریموٹ کنٹرول نے ہمارے ہاتھوں سے کتاب چھین لی ہے۔ اگر ایسے دور میں کوئی ناول لکھے تو کون پڑھے گا۔ البتہ افسانہ آج بھی پڑھا جاتا ہے مگر شرط مختصر ہونے کی ہے کہ طویل افسانے کے لیے بھی لوگوں کے پاس وقت نہیں اور مختصر افسانے لکھنا بھی ایسا آسان نہیں۔ کہ جو بات دس بیس صفحات کی متقاضی ہو اسے ایک دو صفحات میں سکیڑ لینا بڑے ہنر کی بات ہیں۔

کہانی کو اختصار کے سانچے میں اس طرح دبا کر لکھنا کہ کہانی کا پلاٹ بھی مجروح نہ ہو محنت طلب کام ہے جس کے لیے تجربے کے ساتھ ساتھ گہری سوچ مطلوب ہے۔

رؤف خیر:

ایک زمانہ تھا اے آر خاتون، شمع خاتون وغیرہ ناول نگاروں کے ایک ایک ہزار صفحات پر مشتمل ناول بھی بعض لوگ بڑے اشتیاق سے پڑھا کرتے تھے۔ ان دنوں ترقی معکوس کا یہ عالم ہے کہ یک سطری کہانیاں لکھی جانے لگی ہیں۔ اس میں شک نہیں الیکٹرانک میڈیا کے مصروف ترین انسان کے لیے سینکڑوں صفحات کی ورق گردانی ممکن نہیں مگر وہ بہر حال اتنا بھی عدیم الفرصت نہیں کہ صرف ایک لائن کی کہانی پڑھ کر تشفی پا جائے۔

عارف نقوی (جرمنی):

میں اس موقع پر اس بحث میں جانا نہیں چاہتا کہ افسانچوں اور مختصر افسانوں کا ادب میں کیا مقام ہے اور افسانہ کہاں سے شروع ہوتا ہے اور ان میں سے کسی کی اہمیت زیادہ ہے، بالکل اسی طرح جیسے یہ بحث بے کار ہے کہ نظم کی اہمیت زیادہ ہے یا غزل کی یا مثنوی، مرثیے اور قصیدے کی یا قطعے اور رباعی کی؟ کبھی کبھی کوئی شاعر ایک ایسا شعر کہہ جاتا ہے جو دل میں بیٹھ جاتا ہے حالاں کہ اسی غزل کے دیگر اشعار ہمیں یاد نہیں رہتے۔ مثلاً ہندی کا یہ دوہا:

کاگا سب تن کھائیو چن چن کھائیو ماس
دو نیناں مت کھائیو پیا ملن کی آس

یا جگر کا یہ شعر:

ان کا جو کام ہے وہ اہل سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

میں سمجھتا ہوں کہ ہر فن کا اپنا مقام ہوتا ہے اور یہ ہماری کم ظرفی یا کوتاہ نظری ہوتی ہے کہ جب کچھ سمجھ میں نہ آئے تو ایک کا دوسرے سے مقابلہ کرنا شروع کر دیں اور سرٹیفکیٹ بانٹنے لگیں۔ مثلاً یہ دعوا کرنا کہ پورا افسانہ پڑھنے کے لیے قاری کے پاس وقت نہیں ہوتا ہے، غلط ہے۔ کیوں کہ اگر کہانی جان دار ہے، اس میں غیر ضروری باتوں کی بھر مار نہیں ہے اور وہ دل کو چھوتی ہے نیز فن کی ساری شرائط کا لحاظ رکھا گیا ہے تو قاری کی دلچسپی بھی کم نہیں ہوگی اور یہ بات مختصر کہانی یا افسانچے کے مصنف پر بھی لازم ہے۔ جو اپنی مختصر تحریر سے کامیابی کے ساتھ قاری کے ایسی چٹکی لیتا ہے کہ وہ تڑپ جاتا ہے اور بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

یہ سمجھنا کہ مصنف قاری پر چھوڑ دیتا ہے کہ وہ خود مطلب نکالے اور مصنف کی رہنمائی کرے، یہ افسانچے کے مصنف کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ کیوں کہ اس کا کوئی لفظ بھی بغیر سوچے سمجھے نہیں ہوتا۔ وہ اچھی طرح سے جانتا ہے کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے، کیا سمجھانا چاہتا ہے اور قاری کا کیا ردِ عمل ہوگا اور اسے کہاں چٹکی لینا ہوگی۔ کس طرح سے احساس کو کریدنا ہوگا، ضمیر کو بیدار کرنا ہوگا۔

بانو ارشد (یو۔ کے):

اس میں شک نہیں کہ ٹی وی اور میڈیا کی دوسری تفریحات نے قاری کی توجہ افسانے، رسالے کتابیں اور ناول پڑھنے کی طرف ہٹا کر اپنی طرف مبذول کر لی ہیں اور قاری کا ایمان ہوگیا ہے کہ Small is beautiful اس میں شک نہیں کہ مختصر بات اور To the Point بات آج کل کے نوجوانوں کو بھلی لگتی ہے نہ ان کے پاس سننے کا وقت ہے اور نہ ہی

پڑھنے کا اور وہ غیر ضروری تفصیلات میں جا کر اپنا وقت برباد کرنے کو تیار نہیں اور بھی کام ہیں پڑھنے کے سوا۔ مختصر افسانے اور افسانچوں پر چند رسائل نے بھی توجہ دی ہے مثلاً 'شاعر ممبئی' جس کے مدیر افتخار امام صدیقی [مرحوم] ہیں۔ انھوں نے چند شمارے اس موضوع پر نکالے اور بہت سے افسانہ نگاروں اور تنقید نگاروں سے مضامین لکھوائے اور اس فن پر بحث و مباحثے کا ایک دفتر کھولا۔

ڈاکٹر امام اعظم:

منی کہانی یا افسانچے کہانی ہی کے تجرباتی اُفق سے ابھرے ہیں T.O.Bleach نے اپنی تصنیف The Modest Art: Some Problems Craft میں لکھا ہے: ''کہانی کے مقابلے میں افسانہ یا نئی کہانی تحریر کے پیرائے میں بیان ہوتی ہے اور اس طرح بیان ہوتی ہے کہ قاری کی توجہ حاصل کر سکے اور پڑھنے والوں کو تنہائی میں زیادہ گہرائی سے سوچنے اور محسوس کرنے کا موقع مل سکے۔''

احمد صغیر:

افسانچہ لکھنا تلوار پر ننگے پاؤں چلنے کے مترادف ہے۔ افسانچہ نگار کے لیے یہ خطرہ ہمیشہ دامن گیر رہتا ہے کہ کہیں یہ لطیفہ نہ بن جائے یا شعر کا کوئی ٹکڑا نہ سمجھ لیا جائے لہٰذا افسانچہ لکھنے میں زیادہ محتاط رہنا پڑتا ہے۔ ایک افسانچہ نگار کو پھر بھی اُردو فکشن میں وہ مقام نہیں مل پایا جس کا وہ مستحق ہے۔

خورشید اقبال:

افسانہ اردو ادب کی مشکل ترین اصناف میں سے ایک ہے۔ کیوں کہ افسانہ نگاری محض قصہ گوئی نہیں ہے اور بھی بہت کچھ ہے۔ یہ ایک جدید صنف ہے جس میں اختصار سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ یہاں اپنی بات کو کم سے کم الفاظ میں اس طرح بیان کرنا ہوتا ہے کہ

مدعا واضح ہو جائے۔ اختصار کے ساتھ ساتھ نئے افسانے میں ابہام بھی بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ افسانہ نگار سب کچھ کھل کر بیان نہیں کرتا بلکہ بہت کچھ قاری کی اپنی فراست پر چھوڑ دیتا ہے۔ افسانے کے اختتام پر پہنچ کر قاری خود بخود نتیجہ اخذ کر لیتا ہے اور بات کی تہہ تک پہنچنے کے بعد اسے جو خوشی حاصل ہوتی ہے وہی افسانہ نگار کی اصل کامیابی ہے۔

مراق مرزا:

میری نظر میں افسانہ نویسی کے مقابلے افسانچہ نگاری کا فن قدرے مشکل ہے۔ افسانہ کا تخلیقی عمل اپنے خالق کو کرداروں پر روشنی ڈالنے اور واقعات و حادثات کی مختصر وضاحت کے لیے مہلت دیتا ہے۔ افسانہ میں پس منظر کے بیان اور مکالموں کی بھی حد تک گنجائش ہوتی ہے مگر افسانچہ محض چند سطروں میں ایک مکمل خیال اور پوری کہانی کے Narrative کا متقاضی ہوتا ہے۔

احسان سہگل (ہالینڈ):

مختصر تحریر میں اپنی بات کا مفہوم ظاہر کرنا سب سے بڑی خوبی ہے۔ شاعر ہو یا فسانہ نگاری اس گہما گہمی کے دور میں ہر شخص انتہائی مصروف زندگی گذار رہا ہے۔ طویل اور ثقیل چیزیں آج کا دماغ قبول نہیں کرتا۔ کوئی تخلیق یا بات مختصر ہے تو ہر کوئی متوجہ ہوتا ہے۔ ایک نظر ڈالنے میں کوئی مشکل محسوس نہیں ہوتی۔

نوٹ: (یہ اقتباسات پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کی مرتب کردہ کتاب: ''ڈاکٹر ایم اے حق اور افسانچہ نگاری کا فن'' 2012 سے ماخوذ ہیں۔)

افسانچے کا فن اور تاثرات

افتخار امام صدیقی:

ایسے افسانچے تخلیق کیجیے کہ جو پھیل کر مکمل کہانی بن سکیں اور اس کے بطن سے ناولٹ، ناول یا کوئی ٹیلی فلم ابھر سکے۔ محض کسی خیال کو 'کاغذ بند' کر دینے کا نام افسانچہ نہیں ہے۔ راقم الحروف نے جب بھی آزاد یا نثری نظمیں لکھیں تو اس کے لیے ابتدا ہمیشہ سے امتحانی رہی ہے اور اختتامیہ بھی کہ نظم کہاں سے شروع ہو اور اچانک کہاں ختم ہو جائے کہ سامع، قاری سبھی اس سے آگے کی سوچ بن جائیں۔ افسانچہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ اس کا ذخیرۂ الفاظ کسی منی فرہنگ سے کم نہ ہو بلکہ اردو، فارسی، عربی، انگریزی زبانوں کی لغات اپنے مطالعے میں رکھیں اور دیکھیں کہ لفظ جب ان فرہنگوں سے آزاد ہوتا ہے اور کسی تخلیق کار کے سوچ کے کینوس پر ابھرتا ہے تو معنی کے نت نئے جہان بھی تخلیق ہوتے چلے جاتے ہیں۔ بزرگوں کے اقوال زریں، خیالات، قصص الانبیاء، جاتک کتھائیں، پنچ تنتر کی کہانیاں، غالب و میر کا کوئی تہہ دار شعر، انھیں افسانچے کا روپ دیا جاسکتا ہے۔ ایک کامیاب اور مختصر افسانچہ جہاں مکمل کہانی ہوسکتا ہے وہیں اسے یک بابی ڈرامے کا روپ بھی دیا جاسکتا ہے۔

نذیر فتح پوری:

کچھ لوگ افسانچے کو آسان صنف سخن سمجھتے ہیں اور اسے بچوں کا کھیل گردانتے ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے جس طرح ہم افسانے میں یا دیگر طویل تحریروں میں اپنی زندگی اور دنیا کے حالات تفصیل سے لکھتے ہیں۔ افسانچہ اس کی اختصاری صورت ہے۔ مختصر میں اگر اپنی

بات عوام تک پہچانی ہے یا اپنے مافی الضمیر کو پیش کرنا ہے تو آپ افسانچے میں کر سکتے ہیں۔ لیکن افسانچے کو لطیفے سے الگ رکھنا ہوگا۔ کچھ لوگ لطیفوں کو بھی افسانچے کے نام پر و ستے ہیں۔ کچھ لوگوں کو دو چار جملے لکھ کر اسے افسانچے کا نام دے دیتے ہیں۔ افسانچے میں گہرائی و گیرائی ہونی چاہیے، ایک مکمل کہانی ہونی چاہیے۔ مہاراشٹر میں کافی افسانچے لکھے گئے۔ اب پورے ہندوستان میں بلکہ پوری دنیا میں افسانچے لکھے جارہے ہیں۔ برطانیہ، امریکہ، کینیڈا وغیرہ میں بھی افسانچے لکھے گئے اور لکھے جارہے ہیں نیز افسانچوں کے مجموعے بھی تواتر سے شائع ہورہے ہیں۔ جس طرح ہم بڑے شخص کے لیے لباس سلواتے ہیں اسی طرح ایک بچے کے لیے بھی سلواتے ہیں۔ بظاہر تو وہ چھوٹا ہوتا ہے لیکن ہوتا لباس ہی ہے۔ اسی طرح افسانچے میں ایک افسانہ ہوتا ہے اور وہی افسانچہ کامیاب افسانچہ کہلاتا ہے

عارف خورشید:

وہ انتہائی مختصر ادبی نثر جس کی قرأت یا سماعت پر لفظوں کی ضرب، قاری کو چونکا دے اور اس کی ابتدا سے قبل کا ماجرا اس کے سامنے روشن ہو جائے اور اختتام کے بعد کی صورتِ حال اسے سوچنے پر مجبور کر دے، افسانچہ ہے۔ خیال کو مجتمع کر کے اس طرح مرکوز شکل دینے، Develop کرنے کی صلاحیت ہو تبھی افسانچہ لکھا جا سکتا ہے۔

پروفیسر حمید سہر وردی:

افسانچہ فکشن کا ایک مختصر ترین اظہار نامہ ہے۔ اس میں وہ تمام فنی لوازمات کارفرما ہتے ہیں جو فکشن کے لیے بنیادی اور اساسی ہوتے ہیں۔ اس میں پلاٹ، کردار، زمان و مکاں اور وحدت تاثر نمایاں ترین عناصر ہیں۔ جس طرح افسانے میں یہ عناصر توازن و تناسب کے ساتھ مستعمل ہوتے ہیں تو افسانہ اپنی دائمی زندگی کا سند نامہ حاصل کر لیتا ہے۔ برخلاف اس کے افسانچے میں خیال اور کسی ایک عنصر کا امتزاج موجود ہو تو اس کی زندگی اثر پذیر اور متوجہ کن ہو سکتی ہے۔ افسانچہ، افسانے سے مختص ہونے کے باوجود اپنی پہچان کو محفوظ رکھتا ہے۔

افسانچہ ایک گہرا تاثر قاری پر چھوڑ دیتا ہے جس میں سنجیدگی، طنز، ناصحانہ بیانات اور سیاسی تبصروں کو کچھ اس طرح سے پیش کرتا ہے کہ افسانوی فن کا احساس ہونے لگتا ہے۔ افسانچہ اپنی پہچان کے باوجود افسانوی عمل کے دائرے میں آتا ہے۔

ارشد عبدالحمید:

فکشن کی جملہ اصناف پر نظر ڈالیں تو ایک بات قابل ذکر ہے کہ جیسے جیسے انسان ترقی کرتا گیا ہے، اس کے فرصت کے لمحات میں کمی آتی گئی ہے۔ جب اس کے پاس وقت کی کوئی کمی نہیں تھی تو وہ ہر رات الاؤ کے گرد بیٹھ کر داستانیں سنا کرتا تھا اور یہ داستانیں مسلسل ہر رات سنائی جاتی تھیں۔ پھر دنیا صنعت کاری کی طرف بڑھی اور لوگ مصروف ہوتے چلے گئے۔ پھر بھی ان کے پاس اتنا وقت تو تھا کہ وہ چار پانچ سو صفحات کا کوئی ناول پڑھ سکیں لیکن دنیا کی مصروفیت تھی کہ بڑھتی ہی جارہی تھی سو فکشن کا ایک مختصر روپ....افسانہ سامنے آیا۔ دنیا نے جتنی ترقی کی، وقت اتنا ہی تنگ ہوتا گیا حتیٰ کہ الیکٹرانک میڈیا کا زمانہ آ گیا اور موبائل کے شیشے پر بس ایک بہت مختصر سے واقعے کی گنجائش رہ گئی اور تبھی سے افسانچہ لکھا جانے لگا۔

افسانچہ، افسانے کی تصغیر ہے یعنی بہت چھوٹا سا افسانہ۔ ہمیں علم ہے کہ افسانہ زندگی کے کسی ایک پہلو کی کسی چھوٹی سی بات کا اظہار کرتا ہے۔ اس سے زیادہ کی گنجائش اس میں نہیں تو اندازہ لگائیں کہ افسانچے میں کتنی زندگی سما سکتی ہے۔ بس ایک احساس۔ ایک چھوٹا سا تأثر جو گاگر میں ساگر کی مانند بہت پر اثر اور معنی خیز ہوتا ہے۔ افسانچے میں واقعہ تو ہوتا ہے لیکن واقعات کی لڑی نہیں ہوتی۔ اس اعتبار سے افسانچے میں فکشن کی بہت سی خصوصیات مثلاً منظر نگاری، جزئیات اور اینٹی کلائمیکس یا مکالموں وغیرہ کی گنجائش نہیں ہوتی۔ بس ایک واقعہ نما ہوتا ہے جس میں آغاز، ارتقاء اور انجام سبھی یکجا ہوتے ہیں۔

اپنے اختصار کے باوصف افسانچے میں دو اسالیب کو زیادہ ترجیح دی گئی ہے۔ ایک راست اظہار جو ایک طرح کی جارحیت لیے ہوئے ہوتا ہے کہ وار سیدھا نشانے پر لگے۔ اسی اعتبار سے افسانچے کا اختتام کسی پنچ لائن پر ہونا اس کی تاثیر میں اضافہ کر دیتا ہے۔ افسانچے کا دوسرا اسلوب

علامتی اسلوب ہے۔جس میں کم الفاظ کے ذریعے زیادہ معنی کو سمویا جاسکتا ہے۔طوالت کے اعتبار سے افسانچہ عموماً ایک پیراگراف سے لے کر تین پیراگراف تک ہوتا ہے۔

محمد علی صدیقی:

کہا جاتا ہے کہ اختصار افسانچے کی سب سے بڑی خوبی ہے۔لیکن صرف اختصار کہنا کافی نہیں ہے۔افسانچہ بھی افسانہ ہی ہے اس لیے ایک اچھے افسانچے میں اختصار کے ساتھ افسانے کے تمام عناصر کا موجود ہونا بھی ضروری ہے۔ اختصار کا یہی عمل افسانچہ نگاری کو مشکل بناتا ہے۔رمزیت اور ایمائیت افسانچوں میں اختصار کے آلے کا کام کرتے ہیں۔

کچھ لوگ الفاظ کی کم تعداد کو ہی اختصار سمجھتے ہیں جو کہ بالکل غلط ہے۔ اگر کسی افسانچے میں اختصار ہو لیکن افسانے کے عناصر موجود نہ ہوں تو وہ کچھ بھی ہوسکتا ہے لیکن افسانچہ نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی افسانچوں کے نام پر کوئی قول، کوئی لطیفہ، کوئی کورا خیال، کوئی مختصر رپورٹ، کسی مضمون کا پیراگراف یا کوئی مکالمہ وجود میں آ جاتا ہے جسے ادب میں قبولیت کا درجہ نہیں مل پاتا۔صرف اختصار افسانچوں کو سوکھی ہڈی بنا دیتا ہے جہاں ڈھانچہ تو ہوتا ہے مگر گوشت پوست اور رنگ و روغن نہیں ہوتا۔افسانچہ کوئی پٹاخہ نہیں ہے کہ پھوٹا اور قاری چونکا۔افسانچے میں پڑھنے کے لیے بھی کچھ ہونا چاہیے۔صرف چونکا دینا کافی نہیں ہے۔ایک اچھے افسانچے میں ایک پورا افسانہ چھپا ہوتا ہے جو قاری کے دماغ میں کھلتا ہے۔اس لیے افسانچے کی طوالت کم سے کم اتنی ضرور ہو کہ قاری کو اختصار لفظی کے ساتھ کم وقت میں افسانوی فرزانیت کا مزہ بھی مل جائے اور کچھ مطالعے کا شوق بھی پورا ہو جائے۔چونکہ ماہرین فن نیا فسانچوں میں الفاظ کی کم سے کم کوئی تعداد مقرر نہیں کی ہے اس لیے کچھ مہم جو افسانچہ نگاروں نے افسانچوں کو ایک سطری اور دوسطری تک پہنچا دیا ہے۔ بے شک وہ ایسا کرنے میں حق بجانب ہیں۔یہ دیگر بات ہے کہ معیاری تخلیقات ہی مقبول ہوتی ہیں اور غیر معیاری تخلیقات خود بخود دم توڑ جاتی ہیں۔

جاوید نہال حشمی:

افسانچہ افسانے کی ہی نہایت مختصر شکل ہے۔ لہٰذا اس کے تمام لوازمات بھی افسانے کے ہی ہوں گے سوائے اختصار کے۔ افسانہ لکھتے وقت آپ کے ہاتھ پاؤں کھلے ہوتے ہیں۔ پوری طرح سے پھیل کر بیٹھنے بلکہ لیٹنے کی آزادی ہوتی ہے۔ مطلوبہ تاثر قائم کرنے کے لیے منظر نگاری سے لے کر جذبات نگاری تک، آپ الفاظ کی حدود کی قید و بند سے آزاد ہوتے ہیں۔ مگر افسانچوں میں وہی تاثر قائم کرنا، وہ بھی گنے چنے لفظوں میں، ایک نہایت مشکل کام ہے۔ اس کے لیے نہ صرف اشاروں، کنائیوں اور منتخب الفاظ کی مدد لی جاتی ہے بلکہ کردار کے حرکات وسکنات بھی اپنے آپ میں بہت کچھ کہتے جاتے ہیں جس کے لیے افسانوں میں عموماً مکالموں کا سہارا لیا جاتا ہے۔ افسانچوں میں کردار کی ایک ایک حرکت نیز نظروں اور ابروؤں وغیرہ کے اشاروں سے نہ صرف کئی مکالمے ادا ہوتے جاتے ہیں، بلکہ ذہنی کیفیات کی بھی عکاسی ہوتی رہتی ہے۔ مختصر یہ کہ سب کچھ نہ کہہ کر بہت کچھ کہہ دینا ہی افسانچہ نگاری کی فن کاری ہے۔ دوسرے، افسانوں کے عنوانات اتنی اہمیت کے حامل نہیں ہوتے جتنے افسانچوں کے، کیوں کہ افسانچوں کے عنوانات عموماً افسانچے کا اہم حصہ ہوتے ہیں۔ وہ نہ صرف سسپنس کو قائم رکھنے کے لیے قاری کا ذہن کہیں اور مائل کر کے رکھتے ہیں بلکہ بعض اوقات، اس کے برعکس، کہانی کی تفہیم اس سے اس طرح مربوط ہوتی ہے کہ اس کے بغیر افسانچے کے متن یا پیغام تک پہنچنا مشکل ہوتا ہے۔ لیکن عنوان ایسا بھی نہیں ہونا چاہیے کہ وہ مرکزی خیال کی بھرپور عکاسی کرتا ہو یا سسپنس منکشف کر جائے۔ افسانچے کا سب سے اہم حصہ اس کا اختتامیہ ہوتا ہے جہاں چونکانے کا عنصر یا پنچ لائن موجود رہتی ہے۔ ویسے یہ ضروری بھی نہیں کہ ہر افسانچے کا اختتامیہ ''جھٹکا دینے'' والا ہو۔ بہتیرے کامیاب افسانچے اپنے اختتام پر قاری کے جذبات میں تلاطم پیدا کر دیتے ہیں اور انھیں سوچ میں غرق کر دیتے ہیں۔ حاصل کلام یہ ہے کہ کامیاب افسانچے وہی ہیں جو قاری کے دل و دماغ پر نقش چھوڑ جائیں یا بیساختہ عش عش کرنے پر مجبور کر دیں۔

ریحان کوثر:

قطرہ قطرہ سے دریا بنتا ہے۔ جب وہ دریا کوزے میں سما جائے، اسے اختصار اور جامعیت کی آنچ پر پکائیں تب کہیں صفحۂ قرطاس پر ایک معیاری اور آفاقی افسانچہ رونما ہوتا ہے۔افسانچوں کی مقبولیت اور شہرت کی سب سے اہم وجہ اس کا اختصار ہے۔ دورِ حاضر میں یہ اختصار وقت کی ضرورت ہے۔ غرض یہ کہ آج سوشل میڈیا کے اس دور میں قاری کے پاس طویل تحریریں پڑھنے کا وقت ہی کہاں رہا۔ فلمیں تین گھنٹوں کی ہوا کرتی تھیں۔ انھیں قسطوں میں تقسیم کر کے آدھے آدھے گھنٹے کی سیریز میں بدل دیا گیا۔اب تو نوبت بیس سیکنڈ کے ویڈیوز تک پہنچ گئی ہے۔ ٹک ٹاک وغیرہ کی مقبولیت کی اہم وجہ اس کا اختصار ہی ہے۔ یعنی آج کہانیاں تین گھنٹوں کی فلموں کی جگہ بیس سیکنڈ کے ویڈیوز میں قید کی جانے لگی ہے۔ یہ شارٹ مووی، ویب سیریز، یوٹیوب اور آن لائن ریلیز کا زمانہ ہے۔ جہاں تک واٹس ایپ کی ترسیلات کے مطالعے کا سوال ہے تو قاری سب سے پہلے ترسیل پر ریڈ مور (read more) یہ دیکھتا ہے کہ وہ کتنی طویل ہے۔ اکثر لوگ ریڈ مور آپشن کے آتے ہی ترسیل کا مطالعہ قطع کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں۔اس طرح سے ٹویٹر پر بذات خود لفظوں کی بندش رکھی گئی ہے اور لفظوں کی ان بندشوں کے سبب ٹویٹر پر بھی اختصار کا بول بالا ہے۔سوشل میڈیا پر مختصر اور جامع تحریریں زیادہ شیئر کی جاتی ہیں اور وہ وائرل بھی ہوتی ہیں۔ادب میں سوشل میڈیا کے عمل دخل سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔اسی سوشل میڈیا کے ذریعے آج افسانچے کافی مقبول ہو رہے ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ بعض افسانہ نگار اس صنف سے پوری طرح مطمئن نہیں ہیں، باوجود اس کے یہ صنف مسلسل ترقی اور فروغ حاصل کرنے میں کامیاب ہے۔

سید اسماعیل گوہر:

تخلیقی ادب کا ایک مقصد اصلاحِ معاشرہ بھی ہے۔ ایک ماہر ادیب سماج کو آئینہ دکھانے کا کام کرتا ہے۔ اسی لیے افسانچوں میں بھی تمام فنی لوازمات کے ساتھ ساتھ مثبت محرک کا ہونا بہت ضروری ہے، جو قاری میں تعمیری تحریک اور مثبت سوچ کو پروان چڑھا سکے۔

انٹرویو:

پرویز بلگرامی سے محمد علیم اسماعیل کی گفتگو

[پرویز بلگرامی، کراچی (پاکستان) کے مشہور و معروف کہانی کار ہیں۔ان کا یوٹیوب چینل ''دنیائے افسانچہ'' خالص افسانچوں کے لیے کام کرنے والا پہلا یوٹیوب چینل ہے۔اس چینل پر پرویز بلگرامی بذاتِ خود اپنی آواز میں مختلف قلم کاروں کے افسانچے سناتے ہیں۔ بہت سے ویڈیوز میں انھوں نے افسانچے کے فن پر بھی اظہارِ خیال کیا ہے۔ڈیجیٹل پلیٹ فارم پر افسانچوں کی خدمت، یہ ان کا بڑا کارنامہ ہے جو کافی پسند کیا جا رہا ہے اور مقبول بھی ہو رہا ہے۔ان سے اس موضوع پر ایک پر مغز انٹرویو لیا گیا۔جس کے اہم اقتباسات پیش خدمت ہیں۔]

ع الف : آپ کی ادبی شروعات کب اور کیسے ہوئی؟

پ ب: ادبی دلچسپی انتہائی کم عمری سے رہی، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ والد، والدہ اور بڑی بہن کو ناول پڑھنے کا شوق تھا۔ پہلی کہانی روزنامہ 'جنگ' کے 'نونہال لیگ' یعنی بچوں کے صفحات پر شائع ہوئی تھی۔ کہانی بہت چھوٹی تھی مگر نام کے ساتھ چھپی تھی۔بس وہی سے بڑھا وا مل گیا، شاید 1967 یا 68 کا سال تھا۔

ع الف : افسانچہ کیا ہے اور آپ کے نزدیک افسانچہ کی تعریف کیا ہے؟

پ ب: افسانے میں جتنے لوازمات ہوتے ہیں، افسانچے میں کم سے کم اس کا عکس ضرور ہو۔یعنی ابتدا، کہانی پن اور اختتام چونکانے والا ہو۔پنچ لائن کے بغیر افسانچہ اپنا حسن کھو دیتا ہے۔افسانچے کی خوبصورتی یہ ہے کہ وہ اثر دار ہو۔جیسے منٹو کا مشٹیک ۔ بعد کے افسانچہ نگاروں میں ایم اے حق کا ''مجرم'' پاکستان سے ابن عاصی کا ''ایک مکمل سوال کی

ادھوری کہانی'' عباس خان کا ''ڈوبنے والے''.... میرے نزدیک بغیر کہانی کے افسانچہ ہو ہی نہیں سکتا۔

ع الف: افسانچے میں کیا ہونا چاہیے اور کیا نہیں ہونا چاہیے؟ اور اس کی طوالت کے متعلق آپ کا نظریہ کیا ہے؟

پ ب: افسانچے کا موضوع کوئی بھی ہو لیکن اثر دار ہونا ضروری ہے۔ طوالت جتنی کم ہو اتنا بہتر ہے۔ طوالت افسانچے کو افسانچہ نہیں رہنے دیتی۔ اسے منی کہانی کی جانب موڑ دیتی ہے۔

ع الف: افسانچہ اور لطیفہ میں کیا فرق ہے؟ کیا افسانچے میں بھی افسانویت ہوتی ہے؟

پ ب: افسانچے میں کہانی پن ہوتا ہے۔ اختتام اثر انگیز ہوتا ہے۔ پنچ لائن ہوتی ہے۔ لطیفہ سیدھ میں چلتا ہے۔ اس کا نکتہ ہنسانا ہوتا ہے جب کہ افسانچے کا مرکزی نکتہ چونکانا اور مسائل کا ادراک کرانا ہوتا ہے۔

ع الف: کچھ افسانچے بغیر کہانی پن کے بھی نظر آتے ہیں؟ کیا وہ بھی افسانچہ ہیں؟ یا نہیں؟ کیا افسانچے میں کہانی پن ضروری ہے یا نہیں؟

پ ب: جس افسانچے میں کہانی پن نہ ہو وہ افسانچہ نہیں ہو سکتا۔ جوگندر پال نے افسانچے پر بہت کام کیا۔ خود بھی بہت لکھا اور تحریک دے کر لوگوں سے لکھوایا بھی۔ لیکن بغیر کہانی کا افسانچہ سب سے زیادہ انھوں نے ہی لکھا۔ میرے نزدیک اچھا افسانچہ وہ ہے جو قاری کے ذہن میں پہنچ کر ایک نئے خیال کو جنم دے سکے، آخری جملہ مکمل کرتے ہی قاری کو چونکا دے۔

ع الف: آپ کی نظر میں اب افسانچے کا مستقبل کیا ہے؟ سیاہ یا روشن؟ اور اس کی وجہ بھی بتائیں۔

پ ب: بڑی تیزی سے پڑھنے کا رجحان کم ہو رہا ہے۔ اب طویل کہانیوں کی بجائے لوگ افسانچہ پڑھنا پسند کر رہے ہیں۔ آج کم وقت میں قاری پوری کہانی پڑھنا چاہتا ہے۔ یہ اشارہ ہے کہ آنے والا وقت افسانچوں کا ہے۔

ع الف: اب تک آپ کے افسانچوں کا مجموعہ شائع کیوں نہیں ہوا؟

پ ب: افسانچے لکھ رہا ہوں 80 کی دہائی سے لیکن باضابطہ نہیں لکھا اور کوئی پبلشر افسانچے کے مجموعہ کو خریدنے کے لیے تیار بھی نہیں، اس لیے مجموعہ لایا نہیں۔ پھر زیادہ تر افسانچے محفوظ ہیں بھی نہیں۔ کہانی لکھ کر کچن چلتا ہے، اس لیے صرف شوق میں افسانچے لکھتا رہا ہوں۔ جب کہ کہانی کا اعزازیہ دوبار وصول کرتا ہوں۔ ایک بار تب جب ڈائجسٹ میں چھپتی ہے اور دوسری بار جب وہ مجموعہ یا ناول کی شکل میں شائع ہوتی ہے۔

ع الف: ہندوستان میں افسانچہ نگاری کی سمت ورفتار کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟ پاکستان میں اس صنف کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

پ ب: ہندوستان میں افسانچے زیادہ لکھے جارہے ہیں کیونکہ وہاں اردو کے پروفیشنل رائٹرز نہیں کے برابر ہیں جبکہ پاکستان میں پروفیشنل رائٹرز ہیں جو بطور پیشہ لکھتے ہیں۔ اس لیے ان کا رجحان طویل کہانی کی طرف زیادہ ہوتا ہے۔ قلم کار چاہتا ہے کہ صفحات بڑھ جائے تاکہ اعزازیہ زیادہ ملے یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں افسانچہ نگار بہت کم ہیں۔

ع الف: آپ کا یوٹیوب چینل ''دنیائے افسانچہ''، افسانچہ خوانی کا پہلا اور باقاعدہ یوٹیوب چینل ہے۔ جو ڈیجیٹل پلیٹ فارم پر افسانچے کی خدمت کر رہا ہے۔ ''دنیائے افسانچہ'' کے متعلق کچھ بتائیں؟

پ ب: ''دنیائے افسانچہ'' شروع کرنے کا خیال 2012 میں آیا لیکن مصروفیات کے سبب یہ کام کر نہ سکا۔ پھر 'جنگ' جیسے کثیرالاشاعت اخبار نے جب جناب مبشر زیدی کے افسانچے ''سولفظی کہانی'' کے روپ میں چھاپنے شروع کیے تو میں دوبارہ خاموش ہوگیا کہ افسانچہ کسی بھی شکل میں ہو قاری کو متوجہ تو کر رہا ہے۔ لیکن لاک ڈاؤن کے دنوں میں جب گھر میں مقید ہوا تو اس سمت کچھ کام کرنے کا ارادہ کیا اور یوٹیوب چینل ''دنیائے افسانچہ'' بنالیا۔ پہلا مقصد یہی ہے کہ نئے افسانچہ نگاروں کو پروموٹ کرنا ہے اور اب تک وہی کر رہا ہوں۔ لیکن دلچسپی قائم رکھنے کے لیے منجھے ہوئے افسانچہ نگاروں کے

ساتھ نئے افسانچہ نگاروں کے افسانچے شامل کر لیتا ہوں۔

ع الف: آپ کا کوئی ایک نمائندہ افسانچہ بطور نمونہ پیش کیجیے۔ جسے پڑھ کر قارئین محظوظ ہو سکیں اور یہ جان سکیں کہ کامیاب افسانچہ کیسا ہوتا ہے۔

پ ب: اب تک میں نے وہ افسانچہ لکھا نہیں ہے جو مجھے لکھنا ہے۔ پھر بھی مجھے اپنا یہ افسانچہ زیادہ پسند ہے۔

قبضہ مافیا

ڈی سی صاحب نے حکم نامہ جاری کیا کہ شہر بھر میں جتنی بھی غیر قانونی تجاوزات ہیں سب کو گرا دیا جائے۔ عملہ فہرست بنانے کے لیے نکل پڑا۔ تین دن بعد رپورٹ ان کی ٹیبل پر تھی جس میں لکھا تھا، ''اس شہر میں سب سے زیادہ انکریچمنٹ ایک نام پر ہوئی ہے۔''

''کون ہے وہ؟'' ڈی سی نے پوچھا۔ ''اسے گرفتار کرنے کے لیے کتنی نفری چاہیے؟''

''اسے گرفتار کرنا ناممکن ہے پھر وہ تمام قبضہ اس نے نہیں کیا، اس کے نام پر ہوا؟''

''کون ہے وہ۔ کیا نام ہے؟''

''اللہ میاں... ان ہی کے نام پر سب سے زیادہ تجاوزات ہیں۔''

ڈی سی صاحب کا سر جھک گیا کیوں کہ وہ خود بھی ایک غصبی زمین پر بنی مسجد میں نماز پڑھتے ہیں۔ ❖❖

ع الف: افسانچہ نگاری کے فروغ کے لیے، نئے افسانچہ نگاروں کو آپ کیا مشورے دینا چاہیں گے؟

جواب: نئے افسانچہ نگاروں کو مشورہ یہی ہے کہ کم لکھیں لیکن اچھا لکھیں، لکھنے کے بعد کچھ دنوں کے وقفہ سے کئی بار اسے ایڈیٹ کرنے کی نیت سے پڑھیں۔ اضافی الفاظ خود بخود نکل جائیں گے۔

چند منتخب افسانچے

(سعادت حسن منٹو)

سوری

چھری پیٹ چاک کرتی ہوئی ناف کے نیچے تک چلی گئی۔آزار بند کٹ گیا۔چھری مارنے والے کے منہ سے دفعتاً کلمہ تاسف نکلا۔

''چ...چ...چ...چ...مشٹیک ہوگیا۔''

(جوگندر پال)

آمد

چند ہی روز پہلے میں اپنے محلے کے مندر میں گیتا کا پاٹھ سن رہا تھا۔

پنڈت جی رِقّت آمیز لہجے میں بھگوان کرشن کے الفاظ دہرا رہے تھے، جب پاپ ہی پاپ کا دور دورہ ہونے لگتا ہے تو میں جنم لیتا ہوں۔

ہمارے جوتوں کے قریب بیٹھے ہوئے ایک پاگل نے پنڈت جی کو ٹوک کر کہا، میں تو پیدا ہو کے پاگل بھی ہو چکا ہوں پنڈت جی! مجھے کوئی پہچانے بھی!

(سلام بن رزاق)

دیٹس گڈ

دو شخص گائے کی اسمگلنگ میں گرفتار ہو گئے،اُن میں ایک مسلمان اور دوسرا ہندو تھا۔

تھانے دار نے مسلمان سے پوچھا۔''یہ گائے تم نے خریدی ہے؟''

''جی سرکار''

''تم قصائی ہو؟''

''نہیں سرکار، میں تو ایک گوالا ہوں، دودھ کا بیوپار کرتا ہوں۔''

''اچھا، جب یہ بوڑھی ہو جائے تو تم اس کو کیا کرو گے؟''

مسلمان بے چارہ کیا جواب دے، خاموش رہا۔

انسپکٹر گرجا ''ڈالو سالے کو لاک اَپ میں۔''

پھر ہندو سے پوچھا۔''جب یہ بوڑھی ہو جائے تو تم اس کا کیا کرتے ہو؟''

''میں اِسے کسی مسلمان کے ہاتھ بیچ دیتا ہوں۔'' ہندو نے رسان سے جواب دیا۔

''ویٹس گڈ، چھوڑ دو اسے۔''

(ڈاکٹر ایم۔اے۔حق)

میں

ٹرین میں کافی بھیڑ تھی۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ لوگوں نے کمپارٹمنٹ کے دروازے اندر سے بند کر رکھے تھے تا کہ اندر اور زیادہ رش نہ ہو جائے۔

وہ ٹرین میں چڑھنے کے لیے اِدھر اُدھر دوڑ رہا تھا۔ ایک کھلی کھڑکی کے پاس آ کر وہ گڑگڑایا:

''بھائی صاحب میری ماں پٹنہ میں سخت بیمار ہے، آج ہی خبر لی ہے۔ بھگوان کے لیے دروازہ کھول دیجیے بڑی کرپا ہوگی۔''

لوگوں کو اس پر ترس آ گیا اور کسی طرح اسے کھینچ کر اندر لایا گیا۔ وہ پسینے میں شرابور بُری طرح ہانپ رہا تھا۔ کپڑے بے ترتیب سے ہو رہے تھے۔ سر کے بال اُلجھے ہوئے تھے۔ اپنے آپ کو درست کرنے کے بجائے وہ تیزی سے مڑا اور دروازہ بند کر دیا۔ باہر دوسرے لوگ اندر آنے کے لیے شور مچا رہے تھے۔

(محمد بشیر مالیر کوٹلوی)

ناقابلِ برداشت

وہ دونوں جوان تھے خوبصورت تھے۔
اب میں ان دونوں کی صورتیں اپنے گھر میں برداشت نہیں کر سکتا۔
جاتے ہوئے انھوں نے میرے بارے میں کچھ بھی نہیں سوچا۔
میں نے ان کی ساری تصویریں لاک کر ڈالیں۔
ان کے کاغذی عکس دیکھ کر میں اور اہلیہ اپنے ابلتے ہوئے آنسوؤں پر قابو نہیں پا سکتے۔
ہم کچھ بھی تو نہ کر سکے، ہمارا بیٹا اور بٹیا ایک ایک کر کے ہمارے سامنے موت کی آغوش میں چلے گئے۔

(رتن سنگھ) مانک موتی سے۔۔۔

افسانچہ نمبر 20

''اگر انسان راکٹ پر سوار ہو کر دیولوک میں بھی پہنچ گیا تو ہم کہاں جائیں گے؟''
ایک دیوتا نے بھگوان سے پوچھا۔
اس سے پہلے کہ بھگوان کچھ جواب دیتے دوسرا دیوتا بول اٹھا۔
''اگر انسان ایٹمی ہتھیاروں سے لیس ہو کر آیا تو کہیں جانے کی نوبت ہی کہاں آئے گی۔''

(پروفیسر مظفر حنفی)

اخلاقیات

وہ دونوں فوارے کے کارنس پر بیٹھے بڑی دیر سے اخلاقیات پر بحث کر رہے تھے۔ ''دیکھیے نا! کیا زمانہ آ گیا ہے۔ شارع عام پر اس قسم کے مجسمے نصب کرنا کہاں کی تہذیب ہے۔''
''اجی صاحب، کیا عرض کروں۔ ابھی کل ہی ...ارے...''
اور وہ دونوں سامنے سے گزرتی ہوئی برہنہ پگلی کو ٹکٹکی لگا کر دیکھنے لگے۔

(نور الحسنین)

تقلید

لڑکیوں کوفلرٹ کرنے کے سلسلے میں جب وہ سزا کاٹ کر جیل سے باہر نکلا تو ایک پیڑ کے سائے تلے ایک گیانی مہاراج بیٹھے بھگوان کرشن اوران کی گوپیوں کے چرتر پر روشنی ڈال رہے تھےاور سارے لوگ ادب واحترام کے ساتھ داد ستائش دے رہے تھے۔

(امجد مرزاامجد۔لندن)

لوٹنے کا دکھ

ٹرین نے وسل دی۔لوگ دوڑ کر گاڑی میں سوار ہونے لگے۔ٹرین کے دروازے پر ایک نوجوان حسینہ اپنے ساتھی نوجوان سے لپٹی کھڑی تھی۔ٹرین نے جب حرکت کی تو حسینہ کے آنسو چھلک پڑے اوراُس نے اپنے ساتھی کواور زور سے بھینچ لیا۔اُس کا ساتھی اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش میں تھا۔گاڑی کی رفتار تیز ہونے لگی۔نوجوان نے آخری باراُس کو بوسہ دیا اورصبر کی تلقین دے کر چھلانگ مار کر گاڑی سے اُتر گیا۔نوجوان حسینہ دور تک اُسے ہاتھ ہلاتی رہی اوراپنی آنکھوں سے آنسو صاف کرتی رہی۔جب وہ سوگوارسی اپنی سیٹ پر جا بیٹھی تو ایک بزرگ خاتون نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پیار وشفقت سے اُسے تسلّی دی۔

''بیٹی صبر کرو...اپنے شوہر سے بچھڑنے کا بڑا دکھ ہورہا ہے؟''

نوجوان حسینہ نے بوڑھی عورت کو دیکھا اور سسکی لے کر آہستہ سے کہا،''نہیں...اُس کے پاس لوٹنے کا...''

(عارف خورشید)

عقیدہ

اب تم اجمیر کیوں جارہی ہو؟

میں نے منّت مانگی تھی کہ میرا جج کو نمبر لگ جائے گا تو میں وہاں چادر چڑھاؤں گی۔

(م۔ناگ)

سانپ اور آدمی

ایک بھوکا مریل سانپ کسی اُجاڑ بیابان میں پڑا تھا۔ وہ اتنا کمزور تھا کہ چل پھر بھی نہیں سکتا تھا۔ایک دن اسے امید کی کرن نظر آئی۔ اس نے دیکھا کہ ایک مسافر اس کے قریب سے گزر رہا تھا۔اس نے گذارش کی،''میں یہاں دھوپ میں بھوکا پیاسا پڑا ہوں۔ مجھے اٹھا کر کسی اچھی جگہ پر چھوڑ دیجیے۔آپ کا یہ احسان میں عمر بھر نہیں بھولوں گا'' مسافر رک گیا۔سانپ نے دوبارہ وہی درخواست کی اور منّت سماجت پر اتر آیا۔تب مسافر بولا:''میں ایک عام آدمی ہوں اور تم ایک سانپ ہوں۔ میں اگر آج تمھیں بچالوں تو کل مجھے ڈسو گے تو نہیں؟'' سانپ بولا،''چھی ... چھی ... چھی ... چھی ... میں ایسا کیوں کرنے لگا۔آپ تو میری جان بچا کر میرے محسن ہوں گے۔ میں سانپ ضرور ہوں لیکن احسان فراموش نہیں۔ میں تو آپ کے آرام اور چین کا بندوبست کروں گا۔تب مسافر کو اس پر رحم آگیا اور وہ اسے اپنے گھر لے گیا۔جیسے ہی آدمی نے اسے باورچی خانے میں چھوڑا،سانپ نے زور دار پھونک ماری آدی ڈر گیا۔سانپ نے دودھ کی پتیلی سے سارا دودھ پی لیا اور باورچی خانے میں پھنکارتا پھرا۔آدمی ڈر گیا۔اس نے سانپ کو اپنے گھر سے نکالنے کے لیے کافی جدوجہد کی،وہ سرپنچ سے ملا۔پولیس پٹیل اور تلاٹھی سے بھی ملا۔مگر کسی نے کچھ نہ کیا۔گاؤں کے ایک بزرگ نے شکایت سنی تو کان پر ہاتھ ادھرے اور کہا:''سانپ اب پانچ سال تک آپ کے گھر سے نہیں جائے گا۔''

(ڈاکٹر عظیم راہی)

چلن

وہ شخص جس نے میرے قتل کی سازش رچی تھی۔
معجزاتی طور پر ......میرے بچ جانے پر......
مبارکباد دینے والوں میں

وہی سب سے آگے تھا......!!

(پروفیسر اسلم جمشید پوری)

آٹو گراف

مشاعرہ ختم ہونے کے بعد ایک مشہور و معروف شاعر کے کمرے میں ایک کمسن لڑکی داخل ہوئی۔

''مجھے.... آپ...... پ کا آٹو گراف.......''

الفاظ لڑکی کے حلق سے اٹک اٹک کر نکل رہے تھے۔ شاید آٹو گراف لینے کا یہ اس کا پہلا موقع تھا۔

''ہاں...ہا...ں... آؤ بیٹھ جاؤ۔ ابھی دیں گے آٹو گراف۔''

لڑکی دروازے سے جیسے ہی اندر داخل ہوئی۔ خودکار دروازہ بغیر آواز کے بند ہو گیا۔

لڑکی صوفے پر بیٹھنے کے بعد اپنے بیگ سے آٹو گراف بک نکالنے لگی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ شاعر موصوف سے بولی۔

''سر! سوری میں ہڑ بڑی میں آٹو گراف بک تو لانا ہی بھول گئی۔ بس ابھی آتی ہوں...

لڑکی اپنے آپ پر نادم تھی اور اجازت طلب نظروں سے شاعر کو دیکھ رہی تھی۔

''نہیں کوئی بات نہیں۔ آٹو گراف ہی تو لینے ہیں۔ اس کے لیے آٹو گراف بک کا ہونا کوئی ضروری نہیں۔''

(پرویز بلگرامی، کراچی)

نئی قدریں

اسے چوکیدار کی نوکری ملی تو گھر لوگوں سے بھر گیا۔ خالہ بھی اپنی دختر نیک اختر کے ساتھ دوڑی چلی آئیں۔ اندر آتے ہی بولیں، ''اے ہے...ایم اے پڑھ کر کیا ملا۔ جب چوکیداری ہی کرنا تھی تو اتنا پڑھا کیوں؟''

فوراً خالہ کی بیٹی نے اٹھلا کر کہا ''مما آپ بھی ناں...اب جا کران کو عقل آئی ہے۔

ورنہ میں تو منگنی توڑنے کا سوچ رہی تھی۔''

خالہ نے تو قہر بھری نظروں سے بیٹی کو گھورا، پھر کہا،''لیکن میں تو منگنی توڑنے کا سوچ رہی ہوں۔''

''نہ نہ مما ایسا سوچنا بھی نہیں۔ ایم۔اے کرنے کے بعد ان کو کیا ملتا؟ بیس پچیس ہزار...اس میں کیا کھاتے کیا پہنتے۔آپ کو کیا خبر چوکیدار کی نوکری میں اوپر کی آمدنی کتنی ہے۔اب ڈاکو پہلے چوکیدار کو سیٹ کرتے ہیں۔دیکھتے ہی دیکھتے بندہ بلڈنگ کھڑی کر لیتا ہے۔میں تو اب ان کے علاوہ کسی اور کا خواب دیکھ ہی نہیں سکتی......!!''

(مشتاق احمد نوری)

انا

آج وہ اپنی پسند کا سفاری سوٹ پہن کر دفتر گیا۔

چپراسی سے لے کر اس کے کلیگ تک نے اس کے کپڑوں کی جم کر تعریف کی۔گھر آ کر اس نے اس سفاری سوٹ کو تار تار کر دیا۔بیوی کے وجہ دریافت کرنے پر اس نے کہا،''میں یہ قطعی نہیں برداشت کر سکتا کہ کوئی میری شخصیت پر یوں حاوی ہو جائے کہ میں خود کو اگنور محسوس کرنے لگوں۔''

(وکیل نجیب)

خوش خبری

''ہیلو! مولوی سہیل احمد صاحب، مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کے شہر میں ہندو مسلم فساد میں پندرہ مسلمان شہید ہو گئے ہیں۔''

''نہیں مولانا صاحب، صرف تین مسلمان شہید ہوئے ہیں۔''

''لیکن اخبار میں تو 15 مسلمانوں کی شہادت کی خبر شائع ہوئی ہے۔''

''جی ہاں! مولانا صاحب، وہ خبر بھی صحیح ہے لیکن 12 مسلمان اس مسلک کے ہیں جن کے متعلق ہم کفر کا فتویٰ صادر کر چکے ہیں۔''

''چلیے یہ آپ نے بڑی اچھی خبر سنائی، میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔''

(دیپک بدکی)

رکاوٹیں

نہ تو وہ اس کے بطن سے پیدا ہوا تھا اور نہ اس کی چھاتی سے دودھ پیا تھا، پھر وہ اس کی ماں کیسے ہوئی؟ باپ کی دوسری شادی کرنے کے بعد کوئی اس کی ماں تھوڑے ہی بن سکتی ہے۔ وہ بہت دنوں سے اسی فکر و تردد میں جھپٹتا رہا۔

پھر ایک روز اس سے رہا نہ گیا۔ وہ سوتیلی ماں کے غمزوں اور بہکاوے کو روک نہ سکا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ساری رکاوٹیں کافور ہو گئیں۔

(پروفیسر اخلاق گیلانی، لاہور پاکستان)

دنیا کے رنگ

گاؤں کی کئی مائیں لگ بھگ اپنے ایک سال کی عمر کے بچوں کو بڑے چاؤ سے پاؤں پاؤں چلنا سکھا رہی تھیں اور دوسری جانب کئی مائیں تلاشِ رزق میں دور دیس جانے والے بچوں کے پاؤں کی دھمک سننے کی آس لگائے بیٹھی تھیں، جنھیں انھوں نے پہلے پاؤں چلنا سکھایا تھا۔

(رونق جمال)

ضمیر کی اواز

ایک شخص مسجد کے پیش امام کی خدمت میں حاضر ہوا اور دوزانو بیٹھ کر ادب سے کہنے لگا، ''میں گناہ کی اس زندگی سے تنگ آ گیا ہوں۔ بہت ظلم کیا ہے میں نے اپنے آپ پر۔ بے انتہا فریب دیے ہیں اپنے آپ کو۔ بہت ناانصافی کی ہے اپنی ذات سے...میں چاہتا ہوں کہ کچھ اچھے کام کروں۔ آپ مجھے نیکی اور سچائی کا راستہ بتائیے۔''

پیش امام پریشان ہو کر اس کی طرف حیرت سے دیکھنے لگا، ''کہیں یہ شیطان تو نہیں ہے۔''

(نذیر فتح پوری)

تب اور اب

صدیوں پہلے جب میں سفر پر روانہ ہوا تھا تب میری ماں نے اشرفیوں کی تھیلی میری بغل میں ان کاتے ہوئے کہا تھا:

''راستے میں کبھی جھوٹ مت بولنا، چاہے تمھاری اشرفیاں لوٹ لی جائیں۔''

آج صدیوں بعد جب میں سفر پر روانہ ہوا تو میری ماں نے نوٹوں کی گڈی مجھے تھماتے ہوئے کہا:

''راستے میں کبھی سچ مت بولنا، ورنہ لٹ جاؤ گے۔''

(ڈاکٹر اشفاق احمد، ناگپور)

اپنا گریبان

سمیر اپنے گاؤں سے شہر تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے آیا تھا۔ شہر کے کالج میں تعلیم حاصل کرتے ہوئے اُسے تقریباً پانچ سال کا عرصہ ہو چکا تھا۔ ان پانچ سالوں میں وہ اپنی ہم جماعت غزالہ کی محبت میں بھی گرفتار ہوا تھا۔ اب وہ غزالہ کو کسی طرح اپنے سے دور نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ غزالہ بھی اُسے چاہنے لگی تھی۔

ایک دن جب غزالہ نے اپنی امّی سے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ سمیر سے ہی شادی کرنا چاہتی ہے تو اس کے والدین آگ بگولہ ہو گئے اور انھوں نے اس کی خواہش کو ٹھکرا دیا۔ والدین کے انکار کے بعد سمیر نے غزالہ کو چپ چاپ شہر چھوڑ کر کسی دوسرے شہر اس کے ہم راہ چلنے کے لیے راضی کر لیا۔

اب سمیر اپنے کمرے میں بکھرے سامان کو سمیٹ رہا تھا انھیں آج رات ایک بجے والی ٹرین سے شہر چھوڑنا تھا۔

ابھی وہ اپنے سامان کی پیکنگ کر ہی رہا تھا کہ اس کے موبائل کی میوزک بج اٹھی۔

موبائل پر آیا فون نمبر اس کے گھر کا تھا۔ اُس نے موبائل اپنے کانوں سے لگالیا۔ اس کے والد درد بھری آواز میں اس سے کہہ رہے تھے:

''بیٹا تمہاری بہن شہر سے آئے ایک نوجوان کے ساتھ پتہ نہیں کہاں چلی گئی ہے تم فوراً چلے آؤ خاندان کی آبرو خطرے میں ہے۔....!!''

(نخشب مسعود)

بُرا خیال

ایک کتّے کے پلّے نے اپنی ماں سے پوچھا۔ ''مم کیا کبھی ہم بھی انسان تھے؟''

ماں نے بیٹے سے کہا۔ ''کیوں بیٹا ایسا بُرا خیال تجھے آیا کیسے؟''

پلّے نے جواب میں ماں کو بتایا۔ ''آج سڑک پر دو آدمیوں کو ہماری طرح لڑتے جھگڑتے دیکھ کر مجھے ایسا لگا تھا کہ ہم بھی کبھی انسان تھے۔''

(رؤف خوشتر)

تھینکس گاڈ

پیرس کے مضافاتی علاقہ میں مقیم اُس فرانسیسی جوڑے کے چار بیٹے تھے۔ بڑے تین بیٹے تو اپنے سرخ رنگ، لال بال، سیدھی ناک اور اونچے قد کی وجہ سے قابلِ دید تھے۔ لیکن چوتھا بیٹا سانولا اور اس کے بال کالے تھے۔ وہ مریل، کمزور اور ٹھگنے قد کا تھا۔ باپ اس کو دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتا تھا۔ باپ بیمار ہوا اور بسترِ مرگ پر پہنچ گیا۔ ایک رات جب سب چاروں بیٹے سو گئے تو اس نے اپنی بیوی کو بلایا اور سختی سے پوچھا کہ چھوٹا بیٹا کس کا ہے؟

''میں مقدس بائبل پر ہاتھ رکھ کر مسیح کی قسم کھاتی ہوں کہ وہ تمھارا اور ہم دونوں کا ہی بیٹا ہے۔''

بیوی کی سچی بات سن کر بیمار شوہر کے پریشان چہرے پر اطمنان کی لہر دوڑ گئی اور وہ تھینکس گاڈ کہتے ہوئے بڑبڑایا، ''اب میں اطمینان سے مرسکوں گا۔''

بیوی نے شوہر کے اوپر چادر اوڑھاتے ہوئے گاڈ کا شکریہ ادا کیا اور سکھ کی سانس لی۔

وہ زیرِلب بدبدائی، ''میں اب اطمینان سے جی سکوں گی کہ اس کے شوہر نے تینوں بڑے بیٹوں کے بارے میں نہیں پوچھا۔''

(ایم۔مبین)

خوف

چھت پر ایک اے کے فورٹی سیون لہرا رہی تھی۔
پوری پولیس فورس نے اسے اپنے نشانے پر لے لیا تھا۔
اسی وقت ایک آواز ابھری:
''گولی چلانا ہو تو وہ زندہ نہیں بچنا چاہیے۔ اگر زندہ بچ گیا تو ہم میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچ پائے گا۔ یاد ہے نا پولیس تھانے میں اس نے خون کیا تھا اور آج بھی آزاد ہے۔''
ساری بندوقیں جھک گئیں۔
اسی وقت گولیوں کی ایک باڑھ آئی اور 8 پولیس والے ڈھیر ہو گئے۔

(عباس خان، ملتان)

اعلیٰ ادب کا پیمانہ

''میں نے اشاعت کے لیے ایک رسالے کو اپنی کہانی ارسال کی تھی مگر اس نے شائع نہ کی۔''
''قابلِ اشاعت نہیں ہوگی۔''
''میں نے وہی کہانی ایک اور آدمی کے نام سے اسی رسالے کو دوبارہ ارسال کر دی۔''
''پھر؟!''
''وہ شائع ہو گئی۔''
''وہ کیسے؟!''
''جس آدمی کے نام سے میں نے کہانی ارسال کی وہ مشہور تھا۔''

(فاروق ارگلی)

بلا عنوان

شہر کی سب خوب صورت طوائف چندا بائی نے چونک کر شہر کے بہت بڑے بیوپاری کروڑی مل جی کی طرف دیکھا...." کیا آپ سچ مچ مجھے اپنی بیٹی بنانا چاہتے ہیں؟"

"ہاں...." سیٹھ نے نگاہیں نیچی کرتے ہوئے کہا: "تمھیں جس بڑے سرکاری افسر کے پاس بھیجنا چاہتا ہوں اسے یہی بتانا ہے۔"

(اقبال نیازی)

غم غلط

"وہ شاعر بہت اچّھا تھا...ذہین اور بالکل منفرد لب ولہجہ کا...مگر بادہ نوشی نے اس کی زندگی تباہ کردی...روزانہ شراب نوشی اور نشے کی لت نے اُس ذہین شاعر کو ہم سے بہت جلد چھین لیا..."

لوگ اُس شاعر کے تعزیتی جلسہ میں اس کی شراب نوشی کا ذکر کھل کر کررہے تھے...

اس کے سارے احباب جمع تھے...ہر کوئی اپنی تعزیت پیش کر رہا تھا...شاعر کے اہل خانہ بھی وہاں موجود تھے...اور اس کی بادہ نوشی کا ذکر سُن سُن کر شرمندہ ہورہے تھے...اُن کی آنکھیں نم تھیں۔

تعزیتی جلسہ ختم ہوا:

دوست سارے بے تکلّف ہو کر باتیں کرنے لگے...ایک نے کہا..."یار! اپنا دوست تو چلا گیا اس کو کہیں چل کر اکیلے میں یاد کرتے ہیں..."

سب نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا...اور سب قریب کے انگلش بار میں دوست کا غم غلط کرنے کے لیے چل پڑے......

(اشتیاق سعید)

ٹور

بچوں کی ضد تھی کہ اب کی گرمی کی چھٹیاں ہندوستان کے ہل اسٹیشن یا تاریخی مقامات پرنہیں بلکہ بیرون ممالک میں سے کہیں گزاریں گےخواہ نیپال ہی کیوں نا جایا جائے۔ بچوں کی اس ضد سے وہ خاصا پریشان ہوگیا تھا۔ گزشتہ سال کی چھٹیوں میں بچوں کو ہوائی جہاز سے لکھنؤ لے گیا تھا۔ ہفتہ بھر کا ٹور تھا فی کس پچاس ہزارروپے کا صرفہ آیا تھا۔ اب بیرون ممالک کے سفر میں خواہ نیپال جائیں یا سری لنکا لاکھ سوا لاکھ سے کم کا تخمینہ تو ہوگا نہیں۔ وہ یہ سوچتا ہوا بس اسٹاپ پر پہنچ گیا، اچانک بس اسٹاپ پر لگے اشتہار پر اس کی نگاہیں گڑ گئیں۔ لکھا تھا،''حج اورعمرہ ٹور پندرہ دنوں کے لیے محض چالیس ہزارروپے مع طعام وقیام''اور اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ زبان سے بے ساختہ نکلا''واہ! عمرہ کا عمرہ اور کا ٹور کا ٹور....''

(انور مرزا)

شوق

چھوٹا بچہ تمباکو گٹکا خرید لایا...

باپ نے ڈانٹا...

''یہ کیا اٹھالائے...؟ پھینک دواسے...''

''کیوں...؟''

''کیوں کہ یہ بہت بری چیز ہے...!''

''ٹھیک ہے... آپ شوق سے کھاتے ہیں... میں سمجھا اچھی چیز ہوگی!''

(ساحر کلیم)

قطرہ اور سمندر

وہ روز سمندر سے ایک قطرہ اٹھالے جاتا ہے!

میں نے پوچھا،''یہ کیا کرتے ہو؟''

بولا، ’’گھر میں سمندر بنانا ہے۔!‘‘

’’بے وقوف کہیں کے...سمندر کہیں ایسے بنتا ہے؟ اس کے لیے تو اپنے سارے قطرے سمندر کے حوالے کرنے ہوتے ہیں۔!!!‘‘

(عاطف مرزا، پاکستان)

محفوظ مقام

ایک اہم اعلان،

’’طوفان آ رہا ہے، سب لوگوں کو محفوظ مقامات پر جانا ہوگا۔‘‘

ساحلی پٹی کے گاؤں میں ایک بوڑھی بیوہ اور اس کی بیٹی اپنی کل کائنات ایک پوٹلی میں سمیٹ کر محفوظ مقام کی طرف چل پڑیں۔ راہ میں محافظ ملے، انھیں محفوظ مقام پر پہنچانے کا وعدہ کر کے ساتھ لے چلے اور ایک مقام پر رک گئے۔ بوڑھی آرام سے سوگئی۔ اٹھی تو بیٹی محافظوں کے ہاتھوں لُٹ چکی تھی۔ اس نے بیٹی کو ساتھ لیا اور واپس طوفان کی پناہ میں چل پڑی۔

(شازیہ ستار نایاب، لاہور۔ پاکستان)

آوارہ گرد

یوں تو وہ ہر روز دفتر کے بعد دوستوں کے ساتھ تفریح کے لیے چلا جاتا لیکن آج تو لطف دوبالا ہو گیا۔ سب دوست راوی کنارے چلے گئے۔ وہاں گرلز کالج کا ٹرپ آیا ہوا تھا۔ خوب آنکھیں سکیں، فقرے کسے، لڑکیوں کی سیر کا مزہ کرکرا کر کے شام ڈھلے واپس لوٹا تو بلڈنگ کے کمپاونڈ میں بیگم مع بچوں کے مل گئی۔

’’تم یہاں کیا کر رہی ہو؟‘‘ وہ غرایا۔

’’آج فلیٹ میں حبس بہت تھا۔ دل گھبرا رہا تھا۔ بچے بھی تنگ کر رہے تھے تو میں یہاں آ گئی۔‘‘ وہ گھبرا کر بولی۔

’’دفع ہو، اندر گھر میں چین نہیں آتا آوارہ گرد۔‘‘ وہ چلّایا۔

(غنی غازی)

خالی بوتل

وہ دن بھر شراب کے نشے میں دھت رہتا۔ رات کو اُسی حالت میں گھر پہنچتا۔ اب وہ کمزور ہو چکا ہے، چلنے پھرنے سے بھی قاصر۔ اور وہ اپنے اکلوتے بیٹے کے ہاتھوں شراب کی بوتل منگوانے لگا۔ بیٹا روزانہ ایک گھونٹ چکھ لیتا۔ دھیرے دھیرے بیٹے کو بھی چسکا لگ گیا۔ پھر ایک دن بیٹا لڑکھڑاتے قدموں سے گھر پہنچا اور خالی بوتل باپ کے ہاتھ میں تھما دی۔

(رخسانہ نازنین)

سرد و گرم

''بیٹا گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہوگئی ہیں نا۔ بہو اور بچوں کو کچھ دن کے لیے گھر لے آ۔ بڑا دل چاہ رہا ہے بچوں کو ہنستا کھیلتا دیکھوں، تیرے بابا بھی بہت یاد کر رہے ہیں، بڑھاپے میں یہی ایک خوشی تو ہوتی ہے، پوتے پوتیوں کو اودھم مچاتے دیکھنا اور ان کی فرمائشیں پوری کرنا۔'' رابعہ بیگم کے لہجے میں عجیب سی حسرت تھی۔

''امّی یہ ممکن نہیں۔ میں نے شاذیہ سے کہا تھا لیکن اس نے کہا کہ وہاں اے سی نہیں ہے۔ بچے گرمی برداشت نہ کر پائیں گے! اور ویسے یہاں ممی، پاپا ایک منٹ بھی نواسے نواسیوں کے بنا نہیں رہ سکتے!''

(منظور وقار)

بلبلہ

شہر میں ہنگامہ برپا ہونے کے سبب دھارا 144 نافذ ہو چکی تھی۔ وہ سب گلی میں جمع ہو گفتگو کرنے لگے۔

ایک نے کہا، ''ہم اپنی مقدس عمارت کے انہدام کا بدلہ ضرور لیں گے۔''

دوسرے نے کہا، ''ہم آن ہاتھوں کو کاٹ ڈالیں گے جو اس عظیم سانحے کا باعث بنے

تھے۔''

تیسرے نے انتباہ دیا،''بہت جلد ہم ان کی مقدس عمارتوں کو بھی مسمار کر دیں گے۔''

چوتھا بولا،

''اب ہم لوگ سر پر کفن باندھ چکے ہیں۔ ہمیں کوئی بھی طاقت نہیں ڈرا سکتی۔''

پھر ایسا ہوا کہ سارے لوگ بڑی تیزی سے اپنے اپنے گھروں کی جانب لپکنے لگے۔

سامنے سے پولیس کی جیپ آ رہی تھی۔

(رفیع الدین مجاہد)

ڈر

''تمھیں قبرستان سے اتنا قریب رہتے ہوئے مردوں سے ڈر نہیں لگتا؟''

اس نے گورکن سے پوچھا۔

''اب مردوں سے کاہے کا ڈر!''

گورکن نے جواب دیا۔

''سچ کہا تم نے۔''

اس نے گورکن کی جوان اور خوبصورت بیٹی کو دیکھ کر کہا۔

''ڈر تو زندہ انسانوں سے ہوتا ہے!''

(ڈاکٹر یاسمین اختر)

اھمیت

دوپہر لگ بھگ تین بجے صدیق نے اپنے ایک خاص دوست جمشید کو فون پر بتایا:

''تمھارے والد محترم کا انتقال ہو گیا ہے۔''

''کیا ابو چلے گئے؟'' جمشید کے لہجے میں فکرمندی نہیں حیرانی تھی ''تم انتظام کرو، میں ایک گھنٹے میں آ رہا ہوں۔''

صدیق کو کچھ عجیب سا لگا۔ ایک لمحہ کے لیے وہ سوچ میں پڑ گیا پھر کہنے لگا، ''یہ کیا جمشیدا گلے ہفتہ جب تمھارا نوکر کلو مرا تھا تو تم پھوٹ پھوٹ کر روے تھے لیکن آج ... ''

جمشید نے بلا جھجک کہنا شروع کیا، ''میں کلو کے لیے نہیں اپنی قسمت پر رو رہا تھا۔ کلو کے جانے کے بعد ابّو کی ساری ذمے داری مجھ پر آ گئی تھی....

(اسداللہ شریف، میسور)

خوف

''دیدی... آخر آپ کو یہ کیا ہوگیا ہے! کہاں گئی آپ کی وہ خودداری؟ وہ رعب .. دوسروں کو کبھی خاطر میں نہ لاتی تھی... لیکن اب... جب سے بہو لائی ہیں آپ اس کے سامنے بھیگی بلی بنی رہتی ہیں۔ اس کی ہاں میں ہاں ملاتی رہتی ہیں۔ اس کی خوشامد میں لگی رہتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے آپ بہو ہیں اور وہ ساس.... ''

گھر آئی اپنی چھوٹی بہن کی باتیں سن کر اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ گلوگیر آواز میں بولی۔

''چھوٹی... میں نے پتی کو تو کھو دیا ہے۔ اب... اپنے بیٹے کو کھونا نہیں چاہتی۔''

(کرن صدیقی، پاکستان)

پرستار

آپ میری پسندیدہ اسٹار ہیں، میں آپ کا بہت بڑا فین ہوں۔

بہت شکریہ!

میں آپ کو بتا نہیں سکتا آپ مجھے کتنی پسند ہیں۔ آپ میری آئیڈیل ہیں۔ جب مجھے اس تقریب کا علم ہوا میں نے ہر ممکن کوشش کر کے کارڈ حاصل کیا صرف اس لیے کہ اپنی آئیڈیل عورت کو قریب سے دیکھ سکوں۔

فاریہ کا پرستار نجانے کیا کیا کہتا گیا۔ فاریہ یہ سب سن کر دھیرے دھیرے مسکراتی رہی۔

بہت شکریہ!

آپ شاید یقین نہ کریں لیکن میں اپنی بیوی کو آپ کی ہر فلم ضرور دکھاتا ہوں تاکہ وہ آپ کے ہر انداز کو کاپی کرے۔

وہ اس تقریب میں نہیں ہیں؟ فاریہ نے سرسری سے انداز میں سوال کرلیا۔

اس نے تو یہاں آنے کی بہت ضد کی تھی لیکن میں نے اسے سختی سے ڈانٹ دیا کہ یہاں شریف عورتوں کا کوئی کام نہیں۔

اس شخص کے لہجے میں بے پناہ حقارت تھی اور فاریہ کو لگا جیسے کسی نے اسے سر بازار عریاں کر دیا ہو۔

(عبداللطیف جوہر)

خوابِ غفلت

گاہک: ”یہ کیسی الارم گھڑی دی ہے آپ نے؟ فجر میں آنکھ ہی نہیں کھلتی۔“

دکان دار: ”معاف کیجیے گا! یہ صرف نیند سے بیدار کرنے کے لیے ہے۔“

(حنیف قمر، ممبئ)

نئی گونج

”لکی بیٹا... میرا چشمہ تو لے آنا...!“

”جی گرانڈ پا...“

چار سالہ لکی کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ چشمہ میرے حوالے کرتے ہوئے زور سے چھینکتا ہے اور کہتا ہے: ”اوہ... سوری... گرانڈ پا...“

میں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کے ریشمی سنہرے بالوں کو سہلاتے ہوئے کہا: ”نہیں بیٹے، چھینک آنے پر ایسا نہیں کہتے بلکہ الحمدللہ کہنا چاہیے۔“

”اوہ... نو... اِٹ... اِز... سو... ہارڈ... ٹو... سے... آئی... کانٹ... سے...!“ کہتا ہوا جواب میں مجھ سے پوچھنے لگا، ”میرا نام لیاقت مرزا ہے نا...؟ تو پھر مجھے لکی، کیوں بلاتے

ہیں؟''

اس سے پہلے کہ میں لگی سے کچھ کہتا، وہ جس رفتار سے میرے کمرے میں آیا تھا اسی رفتار سے باہر چلا گیا۔ میرے کمرے میں گونجتا ہوا یہ سوال کیا آپ کے گھروں میں بھی گونج رہا ہے؟؟؟

(محمد علی صدیقی)

فلیش بیک

وہ ایک ایک تصویر غور سے دیکھ رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ جب بھی اس کے دل کو ٹھیس پہنچتی وہ اس پرانے بکس کو کھول کر بیٹھ جاتی۔ لیکن ذیشان بھی کیا کرتا۔ اس پر ذمے داریاں بھی تو بہت تھیں۔ کبھی کبھی چڑ چڑا ہو جاتا تھا۔

ایک تصویر دیکھ کر اچانک اس کے چہرے پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ تصویر میں وہ ذیشان کو نہلا رہی تھی۔ نہاتے وقت وہ بہت شرارتیں کرتا تھا۔ اتنا پانی اچھالتا کہ وہ تو بھیگ ہی جاتی۔ ایک تصویر میں وہ اس کی انگلی پکڑ کر اسے چلنا سکھا رہی تھی اور یہ تصویر اس وقت کی تھی جب ذیشان نے کھانا شروع کیا تھا۔ وہ اس کے منھ میں میٹھا چاول ڈال رہی تھی۔ ایک تصویر دیکھ کر تو اسے ہنسی ہی آ گئی۔ اس میں ذیشان......

اچانک اسے اپنے پیچھے سسکیوں کی آواز سنائی دی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اس کا بیٹا ذیشان کھڑا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

(مشتاق کریمی)

ترقی

اردو کی ترقی کے لیے بھیجا گیا پروپوزل سرکاری ادارے نے منظور کر لیا۔ پچاس ہزار کا چیک بھی موصول ہو گیا۔ پروگرام بڑی مہارت سے ترتیب دیا گیا۔ ''مخصوص'' مقالہ نگاروں کو مدعو کیا گیا۔ ایک تنگ کمرے میں مقالہ خوانی ہو گئی۔ ایک نے دوسرے کی پیٹھ تھپتھپائی۔ بلند بانگ دعوے فضا میں لہرائے۔ مدعوین نے اپنا اپنا لفافہ سنبھالا اور اس طرح اردو کی

خدمت ہوگئی۔ بیچاری اردو میلے کچیلے لباس میں پھر بھی مسکرا رہی تھی۔خوش ہوگئی کہ اس کے نام پر'سپوتوں' کی اپنی ترقی تو ہو رہی ہے۔

(احمد کمال حشمی)

دعا

آئی۔پی۔ایل میں کولکاتہ نائٹ رائڈرس اور ممبئ انڈینس کا میچ چل رہا تھا۔ میں کولکاتہ ٹیم کا فین تھا اور میرا دس سالہ بیٹا اشہر ممبئ کا۔کولکاتہ کی ٹیم کو جیت کے لیے ممبئ کی ٹیم نے175 رنوں کا ہدف مقرر کیا تھا۔جب جب چوکا یا چھکا لگتا میں خوش ہو جاتا اور جب کوئی وِکٹ گرتا تو اشہر تالیاں بجاتا۔مگر مجھے کولکاتہ ٹیم کی جیت سے زیادہ اپنے بیٹے کی خوشیاں عزیز تھیں۔اس لیے میں دل ہی دل میں خدا سے ممبئ ٹیم کی جیت کی دعا مانگتا رہا۔مگر کولکاتہ نے 175 رنوں کا ہدف پورا کر کے میچ جیت لیا۔

میں نے اشہر سے کہا:''سوری بیٹے۔میں ممبئ کی جیت کے لیے خدا سے دعا کر رہا تھا مگر افسوس خدا نے میری دعا قبول نہیں کی۔''

اشہر نے کہا:''مگر میں تو خوش ہوں پاپا۔خدا نے میری دعا قبول کر لی۔''

(ارشد منیم)

ثبوت

اُن کے طلاق کی وجہ خاوند کی نامردی تھی۔عِدّت کے دن پورے ہوتے ہی ایک عورت اُس لڑکی کے پاس آئی اور مشورہ دیتے ہوئے بولی:

''تیرے لیے ایک مناسب لڑکا میری نظر میں ہے۔تُو کہے تو بات چلاؤں؟''

لڑکی نے سوال کیا:

''کیا وہ ٹھیک ٹھاک بھی ہے؟''

جواب میں اس عورت نے کہا۔

''ہاں... ہاں... کچھ دن پہلے ہی وہ ایک لڑکی کے ساتھ رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔''

(جاوید نہال حشمی)

سبب

''منصور، آخر تم نے اپنے دوست راجیش اور اس کے ساتھیوں کا قتل کیوں کیا؟''
عامر نے انتہائی حیرانگی سے پوچھا۔

''انھوں نے تو فرقہ وارانہ فساد کے دوران تمھاری غیر موجودگی میں تمھاری بہن اور تمھارے والدین کی حفاظت کی تھی۔ میں خود، اور پورا محلّہ اس بات کا چشم دید گواہ ہے۔ انھوں نے سارا مکان اپنی نگرانی میں لے رکھا تھا۔ راجیش نے فسادیوں کو تمھارے گھر میں گھسنے سے روکنے کے لیے پستول تک نکال لیا تھا...''

''سالا جھوٹا کریڈٹ لے رہا تھا۔ میرے ماں باپ کی جان اس نے نہیں، میری بہن نے بچائی تھی!''

(ریحان کوثر)

پیارا کتا

ٹیلی فون کی رنگ سے ڈاکٹر وکاس جین کا گھر گونج اٹھا۔ اداس چہرا لیے ڈاکٹر صاحب نے فون ریسیو کیا تو دوسری جانب سے آواز آئی:

''ہیلو ڈاکٹر صاحب میں راشٹر ماتا رانی پدماوتی وردھ آشرم سے بات کر رہا ہوں۔ اخبار میں اشتہار دیکھ کر معلوم ہوا کہ آپ کا پیارا کتا دو روز سے لا پتہ ہے۔ دراصل آپ کا کتا ہمارے آشرم آ گیا ہے۔ وہ آپ کی 'ماں' کے ساتھ کھانا کھاتا ہے اور سوتا ہے۔ ان کے ساتھ دن بھر کھیلتا رہتا ہے!

آپ یہاں آئیں اور اپنا 'کتا' واپس لے جائیں۔ شکریہ''

(سید اسماعیل گوہر)

رائیگاں

مجھے ایک نئی جگہ کا طویل سفر درکار تھا۔
میں نے تیاری شروع کر دی۔ زندگی بھر محنت کرتا رہا۔ مال جمع کرنے کے لیے دن رات ایک کر دیے۔
آخر کار سفر کا دن آ پہنچا۔ میں نے اپنا تمام ساز و سامان اور نقدی بڑے بڑے سوٹ کیسوں میں بھر لیا اور وقت مقررہ پر بندرگاہ پہنچ گیا۔
لیکن جہاز کے داخلی دروازے پر آویزاں بورڈ میرا منہ چڑا رہا تھا۔
''لگیج آر ناٹ الاؤڈ''

(ڈاکٹر ذاکر فیضی)

جھٹکے کا گوشت

ہوٹل کے ایک کمرے میں صاحب نے کھانے کا آرڈر دیتے ہوئے روم سروس کو تاکید کی: ''اور ہاں میٹ حلال کا ہونا چاہیے۔ میں جھٹکے کا گوشت نہیں کھاتا ہوں۔''
''جی بالکل سر! ہمارے یہاں ذبح کیا ہوا گوشت ہی ملتا ہے۔''
لڑکا آرڈر لے کر جانے لگا تو صاحب نے پھر آواز دی۔
''ارے سنو... ہاں.... یہ بتاؤ''
صاحب نے جھجھکتے ہوئے اپنی ناک پر انگلی رکھتے ہوئے پوچھا.....
''یہاں یہ گوشت بھی ملتا ہے۔ میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا......گرم گوشت!''
''کیوں نہیں سر! بالکل ملتا ہے۔'' لڑکا مسکرایا۔
''تو ڈنر کے بعد اس کا بھی آرڈر لکھ لیں۔'' صاحب نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔
''ٹھیک ہے سر!'' لڑکے بولا۔
وہ جاتے جاتے رکا اور پیچھے مڑ کر صاحب سے پوچھا۔''سر! یہ گرم گوشت حلال کا ہو یا....؟''

(محمد اظہر فاضل، جالنہ)

جی ھاں! میں...

''جی... میں اردو اکادمی کا ذمے دار ہوں۔''
''اکثر میں آپ کو اپنی ہوٹل میں دیکھتا ہوں۔''
''جی ہاں! میں اردو اخبار پڑھنے یہاں آتا ہوں!''

(تنویر اختر رومانی)

پردہ

بہن نے، دوبئی میں ملازم، اپنے بھائی کو وہاٹس ایپ پر خط ارسال کیا:
''بھائی جان! ابّو کولکاتا سے جو برقع لائے ہیں، اس کا ڈیزائن اچھا نہیں ہے.... مجھے پسند نہیں آیا، لیکن مجبوراً استعمال کر رہی ہوں۔ آپ اگلے مہینے آرہے ہیں تو ایک خوبصورت سا برقع میرے لئے لیتے آیئے گا۔ دیکھئے، خوبصورت ڈیزائن والا....ایسا کہ جو دیکھے تو دیکھتا ہی رہ جائے۔''

(اشفاق حمید انصاری)

جملہ پارٹی

بم بلاسٹ کا ملزم ان کی پارٹی سے چناؤ سے لڑ رہا تھا اور وہ صاحب چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے:
''ہماری پارٹی آتنک وادیوں سے لڑ رہی ہے۔''
نیتا جی کا یہ جملہ سن کر پہلا دوست زور زور سے ہنسنے لگا۔ دوسرے نے پوچھا،
''ابے کیوں ہنس رہا ہے؟ کیا یہاں کامیڈی فلم چل رہی ہے۔''
پہلا دوست کچھ سنجیدہ ہو کر کہنے لگا:
''یار ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔''

دوسرے نے جھٹ سے پوچھا:

''کون سی بات؟''

''یہی بات کہ ان کی پارٹی آتنک وادیوں سے لڑ رہی ہے یا آتنک وادی ان کی پارٹی سے چناؤ لڑ رہے ہیں!!!''

(خالد بشیر تیلگامی)

بٹوارہ

تنگ حالی میں جی رہے تین بچوں کے باپ نے اپنے ضعیف والد سے اپنے حصے کی زمین مانگی۔

''نہیں بیٹا! میری زندگی میں تو یہ ممکن نہیں۔''

''بابا! موت وحیات پر تو ہمارا اختیار نہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر آپ سے پہلے کہیں میں اس دنیا سے چلا گیا تو میرے بچوں کے مجوب نہ ہو جائیں۔''

(راحیل ابن انجم)

بِکتا ہوا درد

''ہائے دوستو۔۔۔ کیسے ہو آپ سب۔۔۔ ویسے تو فیس بک پر کئی مرتبہ لائیو آکر آپ سے بات کی ہے لیکن اس بار کا لائیو کچھ خاص ہے۔ یہ ویڈیو آپ لائیو دیکھنے کے ساتھ ساتھ میرے یوٹیوب چینل پر بھی دیکھ سکتے ہیں۔ میں اس وقت کولہاپور کے قریب دانا پور گاؤں میں آئی باڑھ کا منظر آپ کو لائیو دِکھا رہا ہوں۔''

فیس بک پر لائیو ہوتے ہوئے انل اپنی کار سے اترا۔۔۔اور پانی میں ڈوبی بستیاں، باڑھ سے ٹوٹے گھر، ٹینٹ میں رہ رہے دکھی لوگ اور ان کے پریشان چہروں کو لائیو دِکھانا شروع کیا۔ جتنی پریشانی لوگوں کے چہروں پر دِکھ رہی تھی ویڈیو پر اتنے ہی کمنٹس اور لائیکس بڑھتے جا رہے تھے اور ساتھ ہی انل کے چہرے پر خوشی بھی۔ اسے یقین ہو گیا کہ اب

یوٹیوب پر بھی اس کے سبسکرائبر بڑھ جائیں گے۔

(ڈاکٹر سالک جمیل براڑ)

دوسری جیب

وہ شہر میں بالکل اجنبی تھا۔ دوران سفر کسی نے اس کا پرس مارلیا تھا۔ جس میں نقدی کے علاوہ دوسرے ضروری کاغذات اور ڈرائیونگ لائیسنس بھی تھا۔ وہ تو اس کی دور اندیشی تھی کہ اس نے کچھ روپے اپنی دوسری جیب میں بھی محفوظ کر لیے تھے۔ جن کو سنبھالتا ہوا وہ سیدھا پولیس اسٹیشن پہنچا اور اپنے پرس مار لینے کی شکایت درج کروائی۔ جب وہ پولیس اسٹیشن سے واپس لوٹا تو اس کی دوسری جیب بھی بالکل خالی ہو چکی تھی۔

(محمد علیم اسماعیل)

خاموش دھماکا

وہ دروازے کی چوکھٹ پر کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔

''اب یہاں کس لیے آئی ہے۔ ہمیں تجھ سے یہ امید بالکل بھی نہیں تھی، کتنی ذلیل حرکت کی ہے تو نے۔ اب ہمارا تجھ سے کوئی رشتہ نہیں۔ خدا نے ہمیں اولاد کی خوشی سے محروم رکھا، اس لیے کتنے ارمانوں سے تجھے گود لیا تھا ہم نے۔ اب یہاں تیرے لیے کوئی جگہ نہیں۔ جاؤ ہیں، اسی کے پاس جس کے ساتھ منھ کالا کیا ہے۔''

چاچی نے چیختے ہوئے غصے سے کہا:

''اسی لیے تو یہاں آئی ہوں چاچی۔''

اس نے روتے ہوئے بھرائی آواز میں گھر کے ایک کونے میں، سہمے کھڑے۔۔۔۔

چاچا کی طرف دیکھ کر کہا۔

مرتب کے کوائف

نام: محمد علیم
قلمی نام: محمد علیم اسماعیل
ولدین: محمد اسماعیل، محمودہ بی (مرحومہ)
تاریخ پیدائش: 22 جون 1982
جائے پیدائش: ناندورہ (ضلع بلڈانہ، مہاراشٹر)
ملازمت: درس و تدریس (شعبۂ تعلیم، ضلع پریشد بلڈانہ، مہاراشٹر)
تعلیمی لیاقت: ایم۔اے (اردو)، بی۔ایڈ، یو۔جی۔سی نیٹ (اردو)، مہاراشٹر سیٹ (اردو)

تصانیف:

1۔ الجھن (افسانے و افسانچے) 2018
2۔ رنجش (افسانے) 2020
3۔ افسانچے کا فن (انتخاب، ترتیب اور مقدمہ) 2021

متوقع تصانیف:

1۔ خاموش دھماکوں کی گونج (افسانچے)
2۔ دیوار پر بنی ہوئی تصویریں (افسانے)
3۔ اردو افسانہ: ایک مختصر قصہ (مضامین)

رابطہ

Mohd Alim Ismail
Behind Police Station
Nandura-443404(Maharashtra)
Mob:8275047415
mohdalim82@gmail.com
http://www.facebook.com/mohd.alim.965